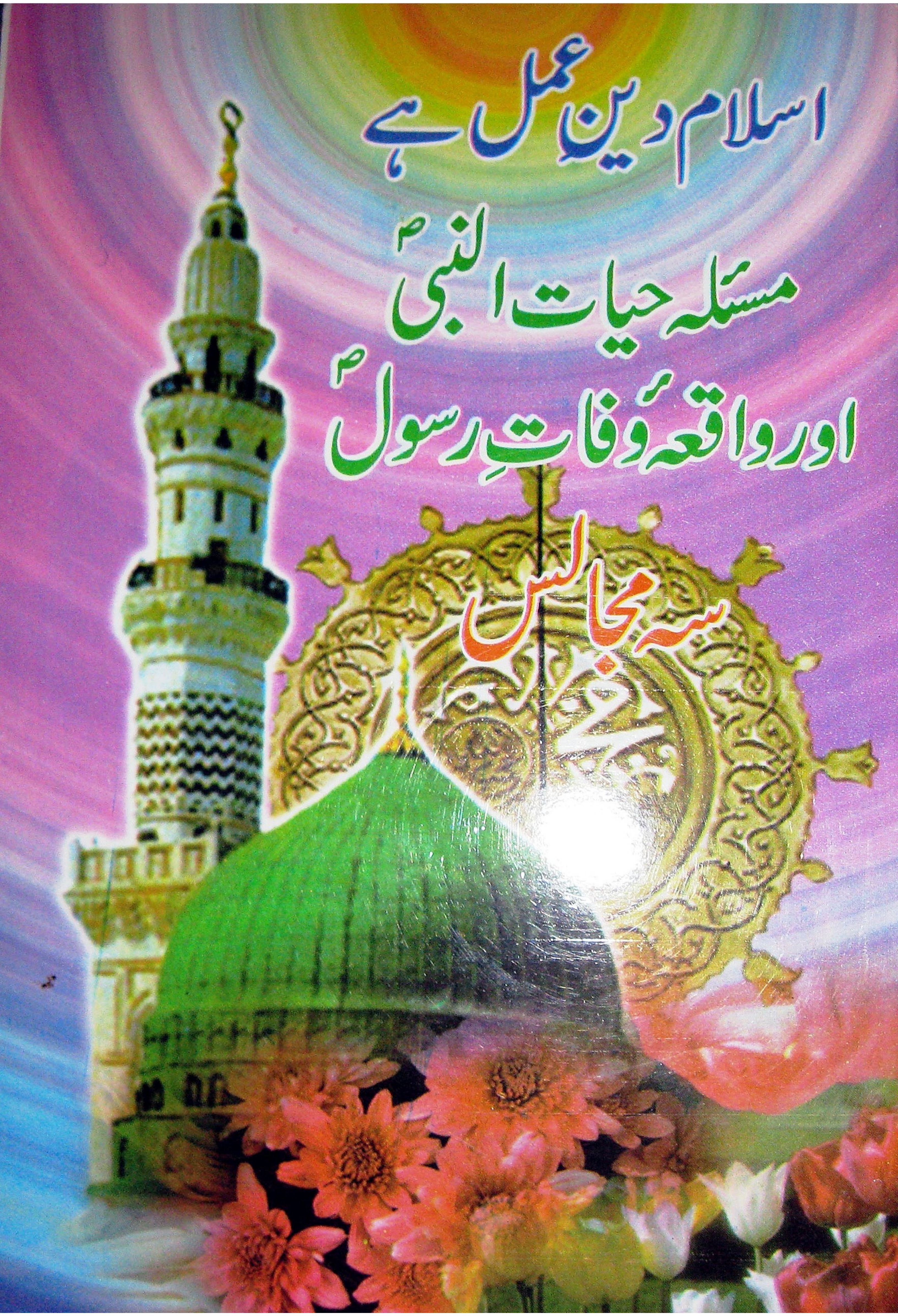


اسلام دین عمل ہے
مسئلہ حیات النبی ﷺ
اور واقعۂ وفاتِ رسول ﷺ
سہ مجالس

بسمہ سبحانہ

ایک اپیل　　اپنی زبان　　ایک اپیل

ہر قوم کی ایک زبان ہوا کرتی ہے زبان قوم کے کلچر کی عکّاسی کرتی ہے زبان باقی نہیں رہتی، کلچر باقی نہیں رہتا اور وہ قوم ہی کیا جس کی کوئی زبان نہ ہو۔

اپنی زبان کو مٹنے نہ دیجئے اس کی حفاظت کیجئے۔ زبان کی حفاظت اپنے کلچرل ویلیوز (Cultural Values) کی حفاظت ہے اپنی ایک پہچان بنائے رکھئے زندہ قوموں کی نشانی ہے۔ اپنے بچوں کو اردو زبان کی تعلیم ضرور دلوائیے اگر اسکول میں ممکن نہ ہو تو خدا رکھّے گھر تو ہے۔ دوسری زبانیں ضرور سیکھی جائیں مگر اردو زبان کو فراموش مت کیجئے یہ آپ کی ذمہ داری ہے اپنی ذمہ داری کو پورا کیجئے۔

الداعی الی الخیر

باقر رضا

انچارج لکھنؤ برانچ

وجوائنٹ ٹریزرار امامیہ مشن ہند

پہلی مجلس

اسلام دینِ عمل ہے

(بتاریخ ۱۱ر نومبر ۱۹۷۷ء ۹ ربجے شب)

سن ۱۳۹۷ھ میں انجمن ''پیام اسلام'' کے مجالس منعقدہ امام باڑہ جواہر علی خاں فیض آباد امامیہ مشن کے کارکنان نے شرکت کی تھی۔

سرکار سید العلماءؒ کے یہ دوگراں قدر بیان جو اس سلسلہ کی دو مجلسوں میں ہوئے تھے مشن نے اپنے اہتمام خاص سے لکھوائے ہیں اور اب انھیں سرکار ممدوح کی نظر ثانی کے بعد اس رسالہ کی صورت میں شائع کیا جارہا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْن. وَالصَّلوٰةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ اَبِی الْقَاسِم مُحَمَّدٍ خَاتَمِ النَّبِيِّيْن. وَاٰلِهِ الطَّيِّبِيْنَ الطَّاهِرِيْنَ الْمَعْصُوْمِيْن.

اَمَّا بَعْدُ

فَقَدْ قَالَ اللّٰهُ سُبْحَانَهٗ فِی كِتَابِهِ الْمُبِيْن وَهُوَ اَصْدَقُ الصَّادِقِيْن

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم

يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ. وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ.

قرآن مجید کے تیئسویں پارے میں مختصر ترین تو نہیں مگر مختصر سوروں میں ''سورہ زلزال'' ترتیب قرآنی میں سورۂ عادیات سے پہلے ہے۔ اسی میں کی دو آیتیں ہیں جن کو میں نے عنوان کلام قرار دیا ہے۔

ارشاد ہورہا ہے:

اس دن گروہ گروہ جماعتیں انسانوں کی برآمد ہوں گی۔ تاکہ ان کے اعمال انھیں دکھائے جائیں، جس نے ذرّہ بھر بھی برا عمل کیا ہے وہ اسے دیکھے گا۔

"اعمال دکھائے جائیں گے" یعنی ہر ایک کے اعمال کا انجام اس کے سامنے آئے گا۔

میرا موضوع "اسلام دین عمل ہے" اس میں دو شعبے ہیں:

ایک شعبہ دنیاوی مقاصد کے لئے اور دوسرا اخروی مقاصد کے لئے چونکہ میرے بیان کے لئے دو مجلسیں ہیں اور موضوع وسیع ہے، اس لئے میں ان دونوں شعبوں کو دو مجلسوں پر تقسیم کرتا ہوں۔ اس وقت پہلا شعبہ عمل کا بیان کرنا ہے جو دنیا سے متعلق ہے۔

کوئی کہہ سکتا ہے کہ دنیا سے ایک عالم دین کو کیا مطلب؟ مگر یہ کسی اور دین کا عالم ہو تو اس سے مطالبہ ہو سکتا ہے کہ وہ دنیا سے مطلب نہ رکھے۔ لیکن جو کسی حد تک کہلاتا ہو "دین اسلام کا عالم" اس سے یہ مطالبہ درست نہ ہوگا کہ وہ دنیا سے الگ ہو جائے۔ اسلام نے دنیا کو اپنے دائرہ سے باہر نہیں رکھا تو ایک عالم اسلام کیونکر تلقین کر سکتا ہے کہ دنیا سے مطلب نہ رکھو۔ اگر کوئی یہ کہتا ہو کہ ہمیں دنیا کی ضرورت نہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے اسلام کا علم نہیں ہے۔

بے شک کلام امیر المومنینؑ میں کثرت سے دنیا کی مذمت ہے مگر وہ اس دنیا کی ہے جو مقابل دین ہے۔ ورنہ ہم میں سے کون ہے جو یہ کہے کہ ہمیں دنیا کی کامیابی کی ضرورت نہیں ہے؟

دنیا کے مفادات کیا ہیں؟ مال دنیا، عزت دنیا اور اولاد۔ ان میں سر دست مال دنیا ہی کے بارے میں عرض کرنا ہے۔

کوئی اظہار زہد و تقویٰ کے لئے کہے ہمیں مال کی ضرورت نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں اوّل تو یہ صدا ہی کھوکھلی ہے۔ اگر پیسہ مل رہا ہو، پھر کہیں ہمیں ضرورت نہیں تو ایک بات ہے۔ ورنہ پھر عصمت بی بی، بے چادری کا مضمون ہے۔ لیکن اگر واقعی ذہنی طور پر کسی کو یہ تصور ہو کہ پیسے کی ضرورت نہیں ہے تو یہ تصور اسلام کے نقطۂ نظر سے درست نہیں ہے اگر پیسے کا تصور

نہ ہوتا تو قرآن میں تقریباً ہر جگہ صلوٰۃ اور زکوٰۃ کا نام ایک ساتھ کیوں ہوتا حالانکہ واقعہ بھی ہے کہ جہاں جہاں صلوٰۃ کا ذکر ہے وہاں زکوٰۃ کا بھی ذکر ہے۔

اسلام ''دین عمل'' ہونے کے ساتھ ''دین عقل'' ہے لہٰذا اصحابان عقل غور کریں کہ اس وقت ہمارا معاشرہ کیا ہے؟ شرائط زکوٰۃ کے لحاظ سے زکوٰۃ ہمارے یہاں کتنے آدمیوں پر واجب ہے۔ فیصدی شاید ایک ہو جس میں شرائط زکوٰۃ حاصل ہوں۔ نماز تو سب کو پڑھنا ہے اور زکوٰۃ دو ایک کو دینا ہے تو بلاغت قرآنی کا تقاضا یہ تھا کہ نماز کا حکم اگر سو جگہ پر ہو تو بس دو ایک جگہ زکوٰۃ کا بیان ہو لیکن قرآن میں تقریباً ہر جگہ صلوٰۃ کے ساتھ زکوٰۃ کا حکم ہونا بتاتا ہے کہ قرآن ایک ایسے سماج کی تشکیل چاہتا ہے جو مفلس اور قلاش نہ ہو۔ ایسا سماج جس میں ہر فرد پر جیسے نماز واجب ہے اسی طرح زکوٰۃ بھی واجب ہو۔

ہاں اس ترقی یافتہ اور پھر سوشلزم وغیرہ کے تصورات سے متاثر دور میں کچھ لوگ فلسفۂ زکوٰۃ یہ قرار دیتے ہیں کہ زکوٰۃ کا حکم تو اسی واسطے ہے کہ پیسے زیادہ نہ ہونے پائیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اگر قوم کے پاس پیسہ کا نہ ہونا مدنظر ہوتا تو لینے والوں کو قوم کے اندر کیوں محدود کیا جاتا۔ حالانکہ مستحقین زکوٰۃ، فقراء ومساکین میں شرط ہے کہ وہ مومنین میں سے ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ منظور نہیں کہ قوم کا روپیہ قوم کے اندر سے نکلے۔ مگر مطلوب یہ ہے کہ پیسہ ایک جگہ منجمد نہ ہو جائے جیسے خون تمام جسم میں گردش کرتا ہے اسی طرح پیسہ تمام قوم میں گردش کرتا رہے۔

پھر کوئی کہہ لے کہ پیسے کی مجھے ضرورت نہیں تو کیا روٹی کی بھی ضرورت نہیں ہے؟

بے شک یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ روٹی ذریعہ حیات یا مقصدِ حیات؟ اگر روٹی زندگی کا ذریعہ ہے تو اس کے بعد سوچنا ہوگا کہ مقصدِ حیات کیا ہے؟ اور یہ ظاہر ہے کہ مقصد کا درجہ اونچا ہوتا ہے۔ تو اب بلحاظ اہمیت تین درجے ہوں گے۔ پہلے روٹی، دوسرے زندگی تیسرے مقصد زندگی تو جس طرح روٹی سے زندگی اہم، اسی طرح زندگی سے مقصد زندگی اہم ہے۔ جب روٹی زندگی کی

خاطر ہے تو پھر ایسی روٹی جس کے کھانے سے ہیضہ ہو جائے، حاصل کرنے کے لائق نہ ہوگی۔ اور چونکہ زندگی سے بھی اہم اس کا مقصد ہے تو وہ روٹی بھی ترک کرنے کے قابل نہ ہوگی جو مقصد حیات کو نقصان پہنچائے مثلاً وہ روٹی جو کسی کی جان لے کر ملے یا وہ روٹی جو بے گناہوں کے گھر جلا کر ملے، وہ روٹی جو فتنہ وفساد برپا کر کے ملے۔ اس لئے چھوڑنے کے قابل ہوگی کہ وہ مقصد حیات کو نقصان پہنچاتی ہے اور یہیں سے رزق میں حلال وحرام کا فرق پیدا ہوگا اور جب روٹی کے نظام کے ساتھ جائز وناجائز کے امتیاز کی قید لگ جائے گی تو اس روٹی والے نظام سے اسلام گلے مل جائے گا۔

بہر حال روٹی کی ضرورت ناقابل انکار ہے مگر جس قوم کی عادت ہو۔ بغیر محنت کے روٹی ملنے کی اور خواہش یہی ہو کہ بغیر محنت کے روٹی مل جائے ان کے یہاں ایسے تصورات تراش لئے جاتے ہیں اور کبھی صحیح تصورات کا غلط استعمال کیا جاتا ہے کہ محنت ومشقت کرنا نہ پڑے اور روٹی مل جائے چنانچہ مذہبی حلقہ میں سب سے پہلے ایک تصور بے عملی کو نبھانے کے لئے سامنے لایا جاتا ہے یہ کہ جو تقدیر میں لکھا ہے وہ مٹتا نہیں۔ مقدر میں فاقے ہیں تو فاقے کرنا پڑیں گے اور کھانا ملنا ہے تو مل کر رہے گا۔ محنت ومشقت سے کیا فائدہ؟

میں کہتا ہوں کہ کیا تقدیر کا مسئلہ صرف رزق کے معاملہ میں ہے؟ اگر آپ اس اصول کے قائل ہیں تو بچہ خدانخواستہ بیمار ہو تو ڈاکٹر کے یہاں نہ جایئے۔ اگر زندہ رہنا ہے تو رہے گا۔ ڈاکٹر کے یہاں جانے سے کیا فائدہ؟

اگر کوئی مقدمہ عدالت میں ہو تو کسی وکیل کے پاس کیوں جایئے؟ اگر تقدیر میں ہوگا تو مقدمہ جیتئے گا ورنہ ہار جایئے گا۔

مگر ڈاکٹر کے یہاں جانا، دوا لانا، پھر شیشی کو حرکت دے کر دوا کا منھ تک پہنچانا۔ ایک سلسلہ عمل کا ہے جس سے آپ بے نیاز نہیں ہیں۔ مقدمہ میں وکیل یا بیرسٹر کے یہاں دوڑے، عدالت کے چکر لگائے، تمام ذرائع فراہم کئے...... یہ سب کیا عمل کی منزلوں سے الگ ہے۔ ان

سب منزلوں سے گذرنے کے بعد نتیجہ کے حصول کا انتظار ہوتا ہے۔

دور کیوں جایئے۔ اس وقت آپ مجلس میں آکر میرا بیان سن رہے ہیں تو دور دراز سے یا یہیں کہیں دور یا قریب سے، کسی سواری پر یا پیادہ راستہ طے کر کے آئے۔ زیادہ یا کم جو دشواری پیش آئی اسے ٹالنے کی کوشش کی۔ اس کی کیا ضرورت تھی۔ آرام سے اپنے گھر میں رہتے، تقدیر میں ہوتا تو مجلس سن لیتے۔

یہ سب مشورے اگر کوئی دے اور تقدیر کے مسئلہ کو سامنے رکھ کر دے تو آپ قبول نہ کریں بلکہ اس شخص کو شاید دیوانہ کہیں اور رزق کے معاملہ میں آپ تقدیر پر شاکر ہو کر سعی وعمل سے گریز کریں۔

حقیقت امر یہ ہے کہ بعض اوقات اصل تقدیر یہی ہے کہ تم علاج کرو تو مریض اچھا ہو، تجارت کرو تو نفع ہو۔ حضور والا ان تمام کوششوں کے بعد بھی مقصد حاصل نہ ہو، تب یہ کہنے کا حق ہے کہ ہماری تقدیر میں نہیں تھا۔

اب اگر سوال کیا جائے کہ دو طرح کی تقدیریں کیوں رکھی گئیں؟ میں کہتا ہوں مشروط تقدیر اس لئے رکھی کہ بے عملی پیدا نہ ہو اور کچھ تقدیریں مطلق اس لئے رکھیں کہ تم خدا کو نہ بھولو اور اپنے ہی کو خدا نہ سمجھ لو اس لئے شریعت نے کہا دوا کرو اور پھر دعا بھی کرو دوا اپنے فرض کو ادا کرنے کے لئے اور دعا اس کی رحمت کو متوجہ کرنے کے لئے۔

تقدیر کا عقیدہ حق ہے مگر یہ تصور کہ اس بنیاد پر بے عملی کی زندگی حق بجانب قرار پائی ہے، بالکل غلط ہے۔

ایک دوسرا تصور یہ ہے کہ اللہ رزق کا ضامن ہے۔ جب اللہ ضامن ہے تو پھر ہم مشقت کیوں اٹھائیں؟ یہ سوال امام کے سامنے پیش ہوا جب آپ نے کسی سے فرمایا آخر تم کچھ کرتے کیوں نہیں؟ اس نے جواب دیا اللہ رزق کا ضامن ہے تو ہم کیوں مشقت کریں؟ حضرت نے فرمایا کہ اللہ نے اپنی ذمہ داری پوری کر دی تم کو ہاتھ اور پاؤں دے کر اب اس کی ذمہ داری تم پر ہے کہ تم

اپنے رزق کو ان کے ذریعہ حاصل کرو۔

بے شک حضرت علی ابن ابی طالبؑ کی طرف دو شعر منسوب ہوئے ہیں جن کا مطلب یہ ہے کہ وہ خدا جو بچہ کو شکم مادر میں غذا پہنچاتا ہے ہمیں غذا نہ پہنچائے گا؟

یہ اگر مولا کا کلام ہوتا تو ضرور غور طلب تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ حضرت کا کلام نہیں ہے اور حقیقت کے لحاظ سے درست بھی نہیں ہے اس لئے کہ بچہ کو اللہ رزق اس وقت تک دیتا ہے، جب تک اپنی طرف سے قید خانہ میں رکھتا ہے اور جب وہ اس دار دنیا کی کھلی فضا میں آ گیا تو اب ماں باپ کا فریضہ ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری کو پورا کریں اور اب استدلال کا رُخ پلٹ جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جو بچہ کو بغیر انسانی عمل کے رزق نہ پہنچائے وہ ہم ایسے ہاتھ پیر والوں کو بغیرِ سعی و عمل رزق کیوں دے گا؟

جانور تک رزق حاصل کرنے کے اسباب فراہم کرتے ہیں۔ جب جانور بغیر سعی و عمل کے نہیں کھاتا تو انسان بغیر سعی و عمل کے کیونکر کھا سکتا ہے؟

بہت سے لوگوں کا کہنا ہے کہ جب ہمارے باپ دادا نے تجارت نہیں کی تو ہم یہ ٹکے ٹکے کی چیزیں کیونکر فروخت کریں۔ یہ ہماری بے عزتی ہے کہ ہم پھیری کریں یا دوکان لگائیں۔ جو یہ کہتے ہیں، وہ سنیں کہ آپ کے باپ دادا نے تو کبھی فاقے نہیں کئے تھے۔ یہ حضور والا کیوں فاقہ کرتے ہیں؟

باپ دادا نے ایسا نہیں کیا تھا، اس لئے کہ ان کے پاس مفت کی دولت تھی، انھیں ضرورت نہ تھی اب آپ کو ضرورت ہے تو آپ کو یہ سب کرنا چاہئے۔

اب دوسروں کی ذہنیت اور ان کے طرز عمل کی غلطی یہ ہے کہ کل تک وہ مرزا صاحب، میر صاحب، خان صاحب وغیرہ کہلاتے تھے اور جب سے وہ ترکاری بیچنے لگے، بسکٹ فروخت کرنے لگے تو اب ترکاری والے اور بسکٹ والے کہلانے لگے، میر صاحبی اور خان صاحبی ختم ہو گئی۔ آخر ان کے طرز عمل میں یہ تبدیلی کیوں پیدا ہوئی؟ ان کا یہ عمل ان کی غلط ذہنیت کا ترجمان ہے۔ لیکن انھیں

اس کا برا نہ ماننا چاہئے۔ میں تو کہتا ہوں کہ جب تک وہ میر صاحب اور مرزا صاحب کہلاتے تھے، وہ ایک وصف اضافی کا اظہار تھا۔ اور اب جوان کے کاروبار کے لحاظ سے ان کو پکارا جارہا ہے تو یہ جوہر ذاتی کا اعلان ہے جس پر انھیں فخر کرنا چاہئے۔

ہمارے رہنمایان دین نے اپنے عمل سے ہمارے تصورات کی اصلاح کے لئے سرمایہ فراہم کر دیا ہے۔ ہم زیادہ بتقدیر کے قائل یا رسولؐ خدا اور امیر المومنینؑ؟ ہم خدا کے ضامن رزق ہونے پر زیادہ باایمان یا یہ لوگ؟ ہم زیادہ حقیقی معیار توکل کے جاننے والے یا یہ حضرات؟

پیغمبرؐ خدا نے رسالت سے پہلے اپنا تعارف دنیا سے بحیثیت تاجر کے کرایا۔ تجارت کی اس سے بڑی بلندی کیا ہوگی کہ بربنائے واقعہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک تاجر کو اللہ نے خاتم المرسلینؐ بنایا۔ اب اگر کوئی آدمی تاجر کو حقیر سمجھے تو بات کہاں جاتی ہے؟

اگر تجارت بری چیز ہوتی تو خالق بلند حقیقتوں کی تعبیر تجارت سے نہ کرتا مثلاً ارشاد ہوتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنْجِيكُمْ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ

"اے ایمان والو! کیا میں تمہیں بتاؤں وہ تجارت جو تمہیں دردناک عذاب سے نجات دے۔"

تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ

"وہ یہ ہے کہ اللہ اور اس کے پیغمبر پر ایمان لاؤ اور اللہ کی راہ میں اپنے جان و مال سے جہاد کرو۔"

محسوس ہوتا ہے کہ مخاطب وہ جماعت ہے جو تجارت پیشہ ہے یہاں تک کہ شہداء راہ خدا کو میدان جنگ میں جو رفعت دی جارہی ہے وہ یوں کہ

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ

"اللہ نے مول لیا مومنین سے ان کے جان و مال کو اس قیمت پر کہ ان کے لئے جنت ہے۔"

یاد رکھنا چاہئے کہ قیمت وہ ہوتی ہے جس کی نظر خریدار میں مالیت ہو۔ یہ عام مومنین تھے

جن کا منتہائے نظر جنت ہے۔ ان کے نفوس کی قیمت جنت ہوگئی۔ لیکن اگر کوئی ایسا بلند نظر بندہ ہو کہ وہ بارگاہ الٰہی میں کہتا رہا ہو:

مَا عَبَدْتُکَ طَمَعًا فِیْ جَنَّتِکَ وَلَا خَوْفًا مِنَ النَّارِکَ وَلٰکِنْ وَجَدْتُکَ اَھْلًا لِلْعِبَادَۃِ فَعَبَدْتُکَ

''میں نے تیری عبادت تیری جنت کی لالچ میں نہیں کی، نہ تیری اس آگ کے ڈر سے کی ہے مگر میں نے تجھ کو عبادت کا حقدار پایا اس لئے تیری عبادت کی۔

کیا عبودیت کی نیاز مندی میں اتنی بے نیازی کی شان کبھی تصور میں آسکتی تھی۔ بہر حال اس سے پتہ چل گیا کہ اس بندہ کی نظر میں جنت کوئی قیمت نہیں رکھتی تو اب اس کے نفس کی قیمت جنت کہاں ہوسکتی ہے؟ اس لئے قرآن جب اس کی قیمت بتائے گا تو جنت نہیں بلکہ رضائے الٰہی جس کا جنت ایک ثمرہ ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ نَفْسَہُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰہِ

تو یہ اتنی بڑی قربانی بھی کہ خیبر و خندق کا جہاد بھی جو متحرک انداز کا تھا اتنا عظیم شاید نہ تھا۔ جتنی کہ یہ ساکت و ساکن قربانی تھی کہ بستر رسولؐ پر فدیہ رسولؐ بنے رات بھر سوتے رہے یعنی علیؑ اگر کھلے ہوئے علیؑ ہوتے تو اتنے خطرہ میں نہ تھے جتنے رسولؐ بن کے لیٹنے سے خطرہ میں تھے۔ ہمیں معلوم ہے کہ بھیس بدلا جاتا ہے مگر عموماً بھیس وہ اختیار کیا جاتا ہے جو خطرہ سے دور ہو مرد عورتوں کا لباس پہن کر خطرہ سے نکلا کرتے ہیں مگر یہ نیا بھیس بدلنا تھا کہ جس کی جان لینے کا منصوبہ ہو اس کا بھیس اختیار کیا جائے تو علیؑ نے یہ اتنی بڑی قربانی بحثیت تاجر کی اور بیعنامہ خالق نے قرآن میں اتار دیا مگر یہ نجات نقاب پوش تجارت تھی جس میں خریدار خدا تھا۔

اب وہ وقت ہے جب علیؑ گوشہ نشین نہیں بلکہ خلافت ظاہری کی مسند پر ہیں۔ میثم تمار کی دوکان ہے اور علیؑ بیٹھے خرے تول تول کر گاہکوں کو دے رہے ہیں۔

اب بتائیے کیا تجارت بری چیز ہے؟ کیا محنت ومشقت کرنے سے شرافت خاندانی جاتی رہتی ہے؟

ہمارے چھٹے امام جعفر صادق ایک باغ کی دیوار کو اپنے ہاتھ سے اونچا کر رہے ہیں۔ اصحاب کہتے ہیں: ''مولا! ہم دیوار بنا دیں'' فرماتے ہیں نہیں میں اپنے قوت بازو سے اپنا رزق حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

دوپہر میں بازار کی طرف جا رہے ہیں۔ جسم تمام پسینے سے شرابور ہے، ایک دعویدار زہد وتقویٰ نے پوچھا کہاں جا رہے ہیں۔ فرمایا بازار جا رہا ہوں انھوں نے کہا آپ فرزند رسولؐ ہو کر طلب دنیا کے لئے جا رہے ہیں! کیا آپ کو اس کا اندیشہ نہیں کہ اسی حالت میں موت آجائے جب کہ کار دنیا میں مصروف ہیں۔ حضرت نے جواب دیا: بخدا اگر مجھے اس حال میں موت آجائے تو میں اللہ کو گواہ کروں گا کہ میں تیرے احکام کی تعمیل کی حالت میں دنیا سے گیا ہوں۔

ایک بار ایک جوان بیلچہ کاندھے پر رکھے ہوئے مسجد نبوی کے سامنے جا رہا تھا۔ حاضر الوقت صحابہ میں سے کسی نے کہا، کاش اس کی جوانی راہ خدا میں صرف ہوتی۔ رسولؐ نے کہا، تم نے کیونکر جانا کہ اس کی زندگی راہ خدا میں صرف نہیں ہو رہی ہے؟ یاد رکھو اگر وہ پیٹ پالنے کے لئے جا رہا ہے تو یہ اس کا عمل راہ خدا میں ہے اور اگر اہل وعیال کے لئے آزوقہ فراہم کرنے جا رہا ہے تو یہ اس کا عمل اللہ کی راہ میں ہے ہاں اگر اس خیال سے جا رہا ہے کہ پیسہ حاصل کر کے اپنے اور بھائیوں پر فوقیت جتاوے تو یہ عمل شیطان کے لئے ہے۔ اب یہ جس چیز کو عمل شیطان کہا گیا ہے، اس میں دنیوی سعی وکوشش کی خصوصیت نہیں ہے نماز پڑھنے میں اگر دوسروں پر فوقیت جتانا پیش نظر ہو تو وہ نماز بھی فی سبیل اللہ نہیں ہے۔

بعض مذاہب میں مشقت اٹھانا اور اپنے کو اذیت پہنچانا خود عبادت ہے۔ مثلاً ہاتھ کا اٹھائے رکھنا اور اس طرح اسے خشک کر دینا۔ کئی کئی دن کھڑے رہنا جس سے پیروں پر ورم آجائے

یا اور طرح طرح سے جسمانی اعضا کو اذیت دینا۔ تختہ پر جس میں میخیں گڑی ہوئی ہوں، برہنہ جسم کو معلق رکھنا، مگر اسلام دین عمل ہے۔ دین اذیت نہیں ہے۔ ہاتھ خشک کر لیا تو یہ ہاتھ کس نے دیا تھا؟ اللہ نے۔ اور کسی مقصد کے لئے دیا تھا تو جب ہاتھ خشک کر لیا تو ان مقاصد کو نقصان پہنچایا جن کے لئے ہاتھ عطا ہوا تھا ہاں بے شک اَفْضَلُ الْاَعْمَالِ اَحْمَزُهَا. ''اعمال سب سے زیادہ افضل وہ ہے جس میں زیادہ مشقت ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام میں مشقت با مقصد ہونا چاہئے۔ عبادت کے لحاظ سے فضیلت اس کام کی ہے جس کے لئے مشقت اٹھائی جارہی ہے۔ خود مشقت یا اذیت اٹھانا کوئی کام نہیں اور نہ وہ خود کوئی بلند مقصد ہے مگر دوسروں کے یہاں خود مشقت یا اذیت اٹھانا عبادت ہے۔ اسی طرح جان دینا ہمارے یہاں کوئی چیز نہیں ہے۔

فِی سَبِیْلِ اللّٰهِ جان دینا عبادت ہے اسے کہا گیا ہے۔ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتاً. جو اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں انھیں مردہ نہ سمجھو۔ ہم اس کی تعبیر کرتے ہیں حیات شہداء سے مگر قرآن میں حیات شہداء کے ذکر میں لفظ شہدا نہیں ہے بلکہ معیار شہداء بتایا ہے۔ جو قتل ہوا اللہ کی راہ کون جانے؟ منزل مادی ہو تو راستہ مادی ہوگا۔ یہ ہے اللہ کا راستہ، اب جادہ شناس وہی ہوگا جو منزل شناس ہو لہٰذا جو اللہ کی معرفت کامل رکھتا ہو وہی اس کی راہ کا سمجھنے والا ہو سکتا ہے۔ اسی لئے بغیر اذن معصوم جو ہو وہ جنگ ہوگی مگر جہاد نہ ہوگا۔

اگر خاندانی حمیت پر جان دی تو وہ اللہ کے لئے نہیں ہے۔ اس کا معاوضہ خاندان سے لینا چاہئے۔ اگر حمیت قومی کے لئے جان دی تو یہ اللہ کی راہ میں نہیں ہے۔ قوم سے اس کا صلہ ملنا چاہئے۔ صرف جوش میں کوئی کارنامہ ہوا تو وہ اللہ کی راہ میں نہیں ہے۔

پیغمبر خدا کے زمانہ میں اسامہ نے ایک کافر پر وار کیا اس نے تلوار کی زد پر آکر کلمہ پڑھ دیا مگر ان کا ہاتھ نہ رکا اور اسے قتل کر دیا۔ حضرتؐ نے جب سوال کیا تو انھوں نے کہا کہ دل سے اس نے کلمہ نہیں پڑھا تھا بلکہ جان کے خوف سے پڑھا تھا۔ آپ نے فرمایا: هَلَّا شَقَقْتَ قَلْبَهٗ کیا تم

نے اس کا دل شگافتہ کر کے دیکھا تھا۔ معلوم ہوا کہ ہر قدم پر ہوش رکھنے کی ضرورت ہے، جوش سے کام نہیں چلتا۔

غرض بات تو کاروبار اور طلب معاش کی تھی۔ اب میں کتب رجال کا حوالہ دوں گا۔ اصحاب ائمہ یہ دور معصومینؑ کے ہمارے علماء تھے۔ ان میں سے کسی کے نام کے ساتھ طحال پینے والا، کسی کے نام کے ساتھ تمار ''خرمے بیچنے والا'' کسی کے نام کے ساتھ جمال ''اونٹوں کی ساربانی کرنے والا'' کسی کے نام کے ساتھ تبان یعنی ''گھانس وغیرہ فروخت کرنے والا'' کوئی دھان یعنی ''گھی، تیل بیچنے والا'' اس سے ظاہر ہے کہ محنت ومشقت عزت کے خلاف نہیں ہے۔

فرائض حج میں بھی سعی کی اہمیت ظاہر ہے۔ جس کا پس منظر یہ کہ خلیل حق نے دودھ پیتے بچہ کو اس کی ماں کے ساتھ بے آب وگیاہ میدان میں پہنچا دیا۔ چلتے وقت ایک کوزہ آب اور دو چار روٹیاں دے گئے، وہ کب تک چلیں۔ ظاہر ہے کہ پہلے ماں پر بھوک اور پیاس کا غلبہ ہوا مگر ماں نے اس کو برداشت کیا۔ اس کے بعد ایک وقت وہ آیا کہ بچہ کی فطری غذا کا خزانہ ختم ہوگیا۔ اب بچہ پر بھوک پیاس کا غلبہ ہوا۔ جب ماں نے بچہ کو تڑپتا دیکھا تو کھڑی ہوگئیں اور صفا ومروہ دو پہاڑیوں پر گئیں تلاش آب کے لئے۔ اب خیال ہوا کہ بچہ اکیلا ہے تو دوڑ کر بچہ کے پاس آئیں اور پھر بچہ کا تڑپنا دیکھا نہ گیا تو دوبارہ تلاش آب کے لئے پہاڑی پر گئیں۔ سات دفعہ آئیں اور گئیں۔ عقل سے پوچھیے وہ قادر مطلق جو بعد میں زمزم کو نمودار کر سکتا تھا کیا وہ اس پر قادر نہ تھا کہ پہلے ہی جب غلبۂ عطش ہوا تو زمزم نمودار کر دیتا۔ لیکن اسے تو یہ سنت قائم رکھنا تھی کہ پہلے سعی کرو۔ پھر نتیجہ کا انتظار کرو۔ سعی کرو تو رحمت الٰہی تمہارے شامل حال ہوگی۔

اب قیامت تک کے لئے مسلمانوں کو بھی دونوں پہاڑیوں کے درمیان گردش کرنا ہے اور اس کا نام وہی ''سعی'' ہے۔

یہ سعی کیا ہے؟ ایک بی بی کے عمل کی شبیہ ہے ورنہ ہم جو سعی کرتے ہیں تو کیا ہم تلاش آب

کرتے ہیں؟ نہیں۔ معلوم ہوا کہ اصل مقصد عمل کا تعلق صاحب عمل سے ہوتا ہے اور بعد میں ہمارا کام اس کی یاد کا قائم رکھنا ہوتا ہے۔ صفا و مروہ وہ دونوں پہاڑیاں جہاں یہ سعی ہوئی تھی شعائر اللہ کا جزو بن گئیں۔ حالانکہ جناب ہاجرہ کا صرف قدم مس ہوا تھا۔ ان کے پاؤں سے خون کا قطرہ نہیں ٹپکا تھا۔ پھر بھی یہ دونوں پہاڑ شعائر اللہ بن گئے تو جس زمین میں شہیدوں کا خون جذب ہو گیا ہو، وہ زمین کیا شعائر اللہ میں داخل نہیں ہوگی؟

مناسک حج میں زیادہ تر ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کی یادگاریں ہی ہیں ارشاد ہوا ہے:

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰھٖمَ مُصَلًّی.

ابراہیمؑ کے کھڑے ہونے کی جگہ کو اپنی نماز کا مقام بناؤ۔

اسی بناء پر نماز طواف مقام ابراہیم میں پڑھی جاتی ہے۔ اب بتایئے کہ کیا ابراہیمؑ کا تصور اس نماز میں نہیں رہے گا؟

جو مقاصد الٰہی میں اپنی زندگی صرف کرتے ہیں، ان کی یاد مرضیٔ الٰہی سے ہوتی ہے۔

منیٰ کی قربانی میں حاجی کتنا روپیہ صرف کرتا ہے؟ اور مسلمانوں کا اتنا پیسہ بلا وجہ صرف ہوتا ہے، مگر نہیں یہ بلا وجہ نہیں ہے۔ خاصان الٰہی کی یاد قائم کرنا خود اتنا گرانقدر مقصد ہے جس کے مقابلے میں معاشی پہلو کوئی چیز نہیں ہے۔

یہ قربانی کیا ہے؟ آخر اس میں دس ذی الحجہ کی کیا خصوصیت ہے چونکہ آج سے مدتوں پہلے یہ قربانی ہوئی تھی۔ لہٰذا اس دن اس قربانی کو یاد کرو۔

پھر اگر لفظی یاد کافی ہوتی ہے تو قربانی ابراہیمؑ کی متعلقہ آیتیں پڑھ لیتے مگر خالق فطرت واقف ہے کہ فطرت انسانی میں لفظی یاد اتنی اثر انداز نہیں ہوتی جتنی کوئی مجسم شکل میں عملی صورت، یہ قربانی شبیہ عمل خلیل ہے۔ وہ سعی شبیہ مادر اسماعیل تھی پھر ان جانوروں کو دیکھئے۔ یہ کس کے شبیہ ہیں؟ یہ شبیہ اسماعیل تو نہیں ہیں کیونکہ اسماعیل کا ذبح عملی طور پر پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچا۔ وہ رنج ہوئے

نہیں بلکہ یہ شبیہ اس گوسفند کی ہے جو فدیہ بن کر آیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جانور جو کسی ولی خدا کے کام آئے، اس کی بھی یادگار منانا خالق کو پسند ہے۔ اس کے بعد ذوالجناح کی شبیہ پر کسی کو معترض نہ ہونا چاہئے۔

فریضۂ اسلامی انسانی کسی قربانی کا بھلانا نہیں ہے۔ ۱۰ رذی الحجہ کو فرزند خلیل کی قربانی ہے اور ۱۰ رمحرم کو فرزند حبیب حق کی قربانی۔

جناب ابراہیمؑ سے ہمارا اعتقادی رشتہ ہے۔ عملی رشتہ نہیں اور اپنے رسولؐ سے عملی رشتہ بھی ہے کہ ان کے تعلیمات پر ہمیں کاربند ہونا ہے تو فرزند خلیل کی قربانی کو یاد رکھنے کی ضرورت ہے اور خود اپنے رسول کی قربانی یاد رکھنے کے قابل نہ ہوگی؟

اب کوئی کہے کہ وہ یاد تو بطور عید ہے۔ یہاں غم کیوں کیا جاتا ہے میں کہتا ہوں کہ یہ نتیجہ کے فرق کی بنا پر ہے۔ روز قربانی اسماعیل روز عید ہے اس لئے کہ دنبہ آگیا اور نبی زادہ بچ گیا مگر دس محرم کو فرزند رسولؐ ذبح ہوگیا، اس لئے روز غم ہے۔

اور یہ تصور کہ جو مرتبۂ شہادت پر فائز ہو، اسے رونا نہیں چاہئے غلط ہوگیا۔ جناب حمزہ کی مثال سے کہ جب آپ شہید ہوئے تو رسول کی خواہش کے مطابق انصار کی عورتیں خانۂ جناب حمزہ میں آکر صفیہ کو پُرسا دے کر گریہ کرنے لگیں اور آواز گریہ رسول تک پہنچی تو آپ نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے، اے بی بیو اللہ تم سے راضی ہو تمہارے شوہروں سے راضی ہو تمہاری اولاد سے راضی ہو۔ اب انصاف سے دیکھئے پیغمبرؐ خدا نے خواتین اغیار کے گریہ کی آوازوں پر حسرت سے فرمایا تھا:

اَمَّا عَمِّی حَمْزَۃُ فَلَا بَوَاکِیَ لَہٗ.

میرے چچا حمزہ پر رونے والیاں نہیں ہیں تو اگر رسول کربلا میں ہوتے تو یہ فرماتے کہ

اَمَّا وَلَدِیْ حُسَیْنٌ فَلَا بَوَاکِیَ لَہٗ.

میرے فرزند حسینؑ پر رونے والا کوئی نہیں ہے اور پھر زیادہ حسرت ناک بات یہ ہے کہ

رونے والے ہوں مگر رونے نہ دیا جائے۔

امام حسینؑ کو رونے والے موجود تھے۔

زینبؑ، ام کلثوم ایسی بہنیں، فاطمہؑ سکینہ ایسی بیٹیاں لیلیٰؑ ورباب ایسی بیویاں اور سید الساجدین ایسے فرزند مگر........مگر یہ لوگ رونے کہاں پائے؟ جو رونے کا خاص وقت تھا، اس وقت خیموں میں آگ لگی ہوئی تھی۔ بی بیوں کا عالم یہ تھا کہ ایک خیمہ میں آگ لگتی تھی تو دوسرے خیمے میں چلی جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ آگ کے شعلوں میں سب خیام گھر گئے مگر اب بھی گھبرا کے قدم باہر نہیں نکلتے۔ سمٹ سمٹ کر ثانیٔ زہراء حضرت زینبؑ کے پاس آئیں کہ آپ جانشین فاطمہؑ ہیں، بتائیے ہر طرف آگ کے شعلے بلند ہیں کیا کریں؟

حضرت زینبؑ، یقیناً مسئلہ شرعی سے واقف تھیں مگر فریضہ حجاب کی اہمیت دکھانا تھی کہ فرماتی ہیں بی بیو! مجھ سے کیوں پوچھتی ہو؟ خدا امام وقت کو زندہ رکھے بغیر اس سے پوچھے میں کیا جواب دوں؟ آئیں۔ اب سید سجادؑ کے پاس...... دیکھئے یہ امتحان کیسا سخت ہے؟ ہمارے چوتھے امام سے باپ کے بعد بحیثیت امام مسئلہ کیا پوچھا جاتا ہے؟ وہ یہ ہے کہ پھوپھی سرہانے کھڑی ہیں، کہتی ہیں، بیٹا دیکھو چاروں طرف خیموں میں آگ کے شعلے بلند ہیں۔ اب تم امام وقت ہو، بتاؤ حکم خدا اس وقت کیا ہے۔ جل کر مر جائیں یا خیموں سے باہر نکلیں اور اب سید سجادؑ کو کہنا پڑتا ہے کہ اب خیموں سے باہر نکلئے اور وہ بی بیاں جن کی ماں کا جنازہ رات کو اٹھا تھا، خیموں سے روز روشن میں باہر آتی ہیں اس طرح کہ لَاطِمَاتُ الْوُجُوْہِ نَاشِرَاتُ الشُّعُوْرِ. ''اپنے منھ پر طمانچے مارتی ہوئیں بال سروں کے بکھرائے ہوئے''۔

دوسری مجلس

(۱۲ر نومبر ۱۹۷۷ء ۱۱ ربجے دن)

یَوْمَئِذٍ یَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا لِّیُرَوْا اَعْمَالَهُمْ فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ.

دوسرا شعبۂ آخرت کی کامیابی کے لئے عمل۔ اب دنیا کے مقاصد کے لئے کوئی زاہد کہہ سکتا تھا کہ ہمیں مال کی ضرورت نہیں۔ کامیابی دنیا کی ضرورت نہیں مگر کیا کوئی مومن ایسا ہے جو کہے مجھے جنت کی ضرورت نہیں یا نجات آخرت کی ضرورت نہیں۔ یہ تو وہی کہے گا جو آخرت کا قائل نہ ہو تو جنت اور کم از کم نجات ہر فرد مسلم کا نصب العین ہے۔ مگر تصور یہی ہے کہ ہمیں کچھ کرنا نہ پڑے۔ نتیجہ بہتر سے بہتر حاصل ہو اور سعی کا سوال پیدا نہ ہو۔ مگر میں پورے مطالعہ قرآن کے سہارے سے عرض کر رہا ہوں کہ قرآن میں آخرت کی نوید ہر جگہ عمل پر دی گئی ہے اور جن جن مختلف الفاظ سے اس مقصد کو نمایاں کیا گیا ہے، ان پر اگر کتاب لکھی جائے تو ہر قسم کے آیات کو علیحدہ علیحدہ تفصیل کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً یہ آیت جو میرا سرنامۂ کلام ہے کہ "آخرت میں تمام لوگ نکلیں گے گروہ در گروہ تا کہ ان کے اعمال ان کو دکھائے جائیں تو جو ذرہ برابر بھی عمل خیر کرے گا، وہ اسے دیکھ لے گا وہ جو ذرہ بھی عمل شر کرے گا اسے دیکھ لے گا" یہ ایک باب کی نمائندہ ہے جو عمل کے عنوان سے ہے دوسری صنف ان آیات کی ہے جو سعی کے عنوان سے ہیں: مثلاً

مَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُوْرًا.

جو آخرت کو پیش نظر رکھے۔ اور اس کی خاطر وہ سعی بھی کرے جو اس کے لئے درکار ہے درحالانکہ وہ مومن ہو تو اس کی سعی کی ناقدری نہیں ہوگی۔

بعض آیات میں محسن کی لفظ آئی ہے۔ قرآن حسن عمل کو احسان کہتا ہے یہ یہود و نصاریٰ کا تصور تھا کہ جماعتی طور پر ہم نجات اور داخلۂ جنت کے حقدار ہیں۔

وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَا كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى، تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ.

"ان کا قول ہے کہ بہشت میں ہرگز کوئی داخل نہیں ہوگا، سوا اس کے جو یہودی ہو (یہ

یہودی کہتے ہیں) یا عیسائی ہو (یہ نصاریٰ کا قول ہے)۔

ہماری عام ذہنیت کے مطابق اس کے جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے سوا کوئی بہشت میں نہیں جاسکتا۔

مگر یہ جواب ہی کیا تھا، یہ جو دعووں کا ٹکرانا ہوتا جیسے وہ ان کا ایک نعرہ تھا ویسے ان کے بالمقابل مسلمانوں کا ایک نعرہ ہو جاتا۔

قرآن کہتا ہے ان کے جواب میں یہ کہو کہ اگر تم سچے ہو تو اپنی دلیل پیش کرو۔ اب اس سے یہ اصول قائم ہو گیا کہ بغیر دلیل کے کسی کا دعویٰ قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ.

انھوں نے کہا تھا سوا یہود و نصاریٰ کے کوئی جنت میں نہیں جائے گا۔ ارشاد ہوتا ہے کیوں نہیں! مگر اب یہ نہیں کہا جاتا کہ مسلمان یقیناً جنت میں جائیں گے۔ اگر یہ مسلمان کہا جاتا تو وہ ایک جماعت کا لقب قرار پاجاتا لہٰذا مسلمان نہیں کہا جاتا بلکہ کہا جاتا ہے کہ جو اپنے چہرہ کو بالکل اللہ کی طرف موڑ دے یعنی جو مسلم بنایا جارہا ہے۔

''اور اس کے ساتھ حسن عمل رکھتا ہو'' تو اس کے لئے اس کا اجر ہے۔ یہاں یہ نہیں کہا جاتا کہ ان کے لئے بڑا اجر ہے۔ یا یہ کہ اجر ہے جس سے سمجھا جاتا کہ ہر مسلم کے لئے نیک عمل ہو۔ ایک معین اجر ہے جو یکساں طور پر ملے گا۔ بلکہ لَهُمْ اَجْرُهُمْ ان کے لئے ان کا اجر ہے۔ کیا مطلب؟ یعنی جتنا حسنِ عمل ہوا تنے اجر کا حق ہے۔ اور انجام میں نہ ان کے لئے خوف ہے، نہ ان کے لئے۔ ایک جگہ ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا. خدا نہیں برباد کرتا اجر کو اس کے جو اپنے اعمال کو درست رکھے۔

ایسی ہی کتنی آیتیں قرآن کی ہیں جن میں عمل کی اہمیت، دکھائی گئی ہے۔

سب کا خلاصہ یہ ہے کہ "اسلام دین عمل ہے۔ اب کتنی عبرت کی بات ہے کہ جس قوم کی بنیادی کتاب میں اتنا عمل پر زور دیا گیا ہو، اس قوم میں یہ تصور پیدا ہو جائے کہ اعمال کی ضرورت نہیں ہے۔

اگر مسلمانوں کے اندر کوئی خاص جماعت ایسی ہو کہ وہ نجات کو اپنا خصوصی حق سمجھ لے کہ صرف ہم نجات کے حقدار ہیں تو دیکھنا ہوگا کہ مسلمانوں میں اس جماعت کا امتیاز خاص کیا ہے؟

توحید مشترک، نبوت مشترک، قیامت مشترک، فرقۂ ناجیہ کا امتیاز صرف عدل و امامت سے ہے۔ اور اسی لئے ہم اپنے کو امامیہ کہتے ہیں۔ اب اس جماعت کے کچھ افراد کو تصور ہو کہ ہمیں عمل کی ضرورت نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ امامت کے تصور کا تو لازمی نتیجہ ہے پیروی، اور یہ نبوت و رسالت و امامت ان سب کے لغوی معانی سے ظاہر ہے۔ نبوت اور رسالت جس کا حامل نبی و رسول ہوتا ہے، ان لفظوں کا براہ راست تقاضہ وجوب اطاعت نہیں ہے۔ ان دونوں منصبوں کے علاوہ امامت ہے جس کا حامل امام ہوتا ہے۔ یہ ہمارا خبری امین ہے۔ اب تینوں کے لغوی معنی ملاحظہ ہوں۔

نبی کے معنی ہیں خبر دینے والا تو دوسروں کا کام کیا ہے۔ تصدیق کرنا۔ رسالت کے معنی پیغام پہنچانا تو دوسروں کا کام ہے پیغام کو قبول کرنا۔ لیکن امام کے معنی ہیں۔ آگے آگے چلنے والا تو دوسروں کا کام کیا ہے؟ پیچھے پیچھے چلنا۔ اب اس سے ایک اور پہلو پر توجہ فرمائیے۔ نبی کے معنی خبر دینے والا تو نبی کی ضرورت اس وقت تک کہ جب تک کوئی ایک خبر بھی پہنچانا باقی ہے۔ رسول کا کام پیغام پہنچانا تو جب تک کوئی پیغام پہنچانا باقی ہے اس وقت تک یہ کام ہے اور جب یہ آخری پیغام پہنچا دیا اور تکمیل دین ہوگئی تو اب رسول کی ضرورت نہیں لیکن امام کے معنی ہیں آگے آگے چلنے والا تو جب تک جادہ باقی ہے اور چلنے والے موجود ہیں، تب تک رہنمائی باقی رہنا ضروری ہے۔

تھوڑی دیر کے لئے نماز میں امام جماعت ہوتا ہے تو اس کی پیروی اتنی ضروری ہے کہ

رکوع رکن نماز ہے۔ پسندۂ خدا ہے مگر امام سے پہلے ہوگیا تو باطل۔ سجدہ محبوب ترین عمل ہے مگر امام سے پہلے ہوگیا تو باطل۔ اب انصاف کیجئے کہ امام جماعت کی متابعت ضروری ہو اور جو دین و دنیا کا کلیۃً امام ہو اس کے احکام کی خلاف ورزی کی جائے اور افعال کی متابعت نہ ہو۔ کیا صرف بارہ امام کے نام سنا دینا ہی کافی ہے اور ان کی رہنمائی اور مثالی سیرت سے کوئی بحث نہیں۔ مگر یہ افسوس ناک حقیقت ہے کہ مسلمانوں میں بلاتفریق فرقہ یہ بات ہوگئی ہے کہ عمل سے جان بچاتے ہیں۔ پہلے تمام مسلمانوں نے اپنے کو امت مرحومہ کہہ دیا مگر اس کی کوئی دلیل ہونا چاہئے۔ آخر کیا خصوصیت ہے کہ جو پوری کی پوری امت مرحوم ہو جائے۔ اس کی دلیل یہ کہی جا سکتی ہے کہ چونکہ ہم رحمۃ للعالمین سے وابستہ ہیں اس لئے رحمت الٰہی ہمارے شامل حال ہے۔ لیکن اگر خدانخواستہ ہمارا راستہ رحمۃ للعالمین کے راستے سے الگ ہوگیا تو بتائیے رحمت الٰہی ادھر آئے گی یا اُدھر جائے گی؟

پھر امت ہونا تو ایک رشتہ ہے، ہم رسولؐ سے رشتہ بتا رہے ہیں مگر رسول بھی تو ہمیں اپنی امت میں سمجھیں۔ قرآن مجید میں ایک رسول کی زبانی اعلان ہے:

مَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ.

''جو میری پیروی کرے وہ مجھ سے تعلق رکھتا ہے۔''

اس کے معنی یہ ہیں کہ جو پیروی نہیں کرتا وہ رسول سے تعلق نہیں رکھتا تو امت رسولؐ ہونا کیسا؟ پھر اس کے بعد رسولؐ اپنی امت فرما بھی دیں، اللہ بھی تو رسولؐ کی امت میں جانے۔ کوئی کہے یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ رسولؐ اپنی امت کہیں اور اللہ قبول نہ کرے؟ میں کہتا ہوں کہ حضرت نوحؑ بھی تو رسول تھے، وہ کہہ رہے تھے ''اِنَّهٗ اِبْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ'' میرا بیٹا میرے اہل سے ہے۔ خالق نے پہلی نسبت کی نفی نہیں فرمائی۔ جواب میں یہ نہیں کہا کہ وہ تمہارا بیٹا نہیں ہے مگر دوسری نسبت کے لئے کہا جاتا ہے۔ ''اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِکَ'' وہ تمہارے اہل سے نہیں ہے۔ ''اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ'' اس کے اعمال اچھے نہیں ہیں۔ معلوم ہوا کہ اعمال وہ ہیں کہ بیٹا اہل سے خارج ہو جاتا

ہے۔امت ہونا کیا چیز ہے۔اب جس پیغمبر خاتم کی زبان سے نوحؑ کا واقعہ ہم تک پہنچا ہے، وہ اگر چادر کھینچ کر کبھی کچھ افراد کے لئے کہہ دے۔

اَللّٰھُمَّ ھٰؤُلَاءِ اَھْلِیْ. "پروردگار! یہ میرے اہل ہیں" تو اب دنیا نسبی رشتے نہ دیکھے کہ یہ داماد ہیں، وہ بیٹی ہیں، وہ نواسے ہیں بلکہ محسوس کرے کہ ان کا کردار اتنی بلندی پر ہے کہ پیغمبرؐ اپنے پیغمبرانہ ضمیر کے استحکام کے ساتھ خود اللہ سے مخاطب ہو کر کہہ رہے ہیں کہ یہ میرے اہل ہیں۔

بہر حال یہ تو تمام مسلمانوں کی بات تھی کہ انھوں نے من حیثیت الجماعت اپنے کو امت مرحومہ قرار دیا۔اب امت کے ایک گروہ کا ذکر ہے۔جس نے اپنا لقب قرار دیا "فرقہ ناجیہ" "ناجیہ" سے مطلب نجات پانے والے۔وہ قرآنی مطالبہ کہ اپنی دلیل پیش کرو، ان کی طرف بھی متوجہ ہے مگر بحمد اللہ فرقہ ناجیہ کی ایک فرد ہوتے ہوئے میں اس کی دلیل پیش کر سکتا ہوں۔

یہ حدیث متفق علیہ ہے کہ رسولؐ نے فرمایا:

سَتَفْتَرِقُ اُمَّتِیْ عَلٰی ثَلَاثَۃٍ وَسَبْعِیْنَ فِرْقَۃً کُلُّھُمْ فِی النَّارِ اِلَّا وَاحِدَۃً. "میری امت کے تہتر فرقے ہوں گے جن میں سب آتش دوزخ میں ہوں گے۔سوا ایک فرقہ کے۔

اس سے سمجھ میں آیا کہ تجارت کے لئے امت میں ہونا کافی نہیں ہے۔اس فرقہ میں ہونا ضروری ہے۔اب پیغمبرؐ ہی نے پہچان بھی ناجی فرقہ کی بتائی ہے۔ورنہ پیغمبرؐ خدا پر حرف آتا کہ نجات کے حقدار کی نشان دہی نہ کی۔تہتر راستوں میں ہم کیوں کر صحیح راستے کی شناخت کریں جو منزل تک پہنچائے۔اگر پیغمبرؐ نہ بتاتے تو مسلمانوں کا فریضہ تھا کہ رسولؐ کا دامن تھام کر پوچھیں کہ اس فرقہ کی پہنچان تو بتا دیجئے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبرؐ نے بتایا، اگر بتایا نہ ہوتا تو اصحاب پوچھتے کیوں نہ؟ بے شک بتایا اور ان الفاظ میں بتایا کہ:

مَثَلُ اَھْلِ بَیْتِیْ کَمَثَلِ سَفِیْنَۃِ نُوْحٍ مَنْ رَکِبَھَا نَجَا وَمَنْ تَخَلَّفَ عَنْھَا غَرِقَ وَھَوٰی.

"میرے اہلبیت کی مثال کشتی نوح کی سی ہے جو اس پر سوار ہوا، اس نے نجات پائی اور

جس نے تخلف کیا وہ ڈوبا اور گیا۔" تخلف کے معنی کیا ہیں؟ کشتی پر نہیں بیٹھا یا بیٹھ کر راستے میں کسی منزل پر اتر گیا وہ فرقہ جو کشتی اہلبیتؑ میں سوار ہوا ہے، وہ ناجی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کشتیٔ اہلبیت پر بیٹھنے کا مطلب کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ استعارہ ہے۔ استعارہ کی بنیاد تشبیہ پر ہوتی ہے۔ کوئی ایک بات مشبّہ اور مشبہ بہ میں مشترک ہوتی ہے، وہ وجہ جامعہ کہلاتی ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ کشتی پر بیٹھنے میں کیا ہوتا ہے؟

اس سوال کا مفہوم ان سوالات اور ان کے جوابات سے واضح ہوگا آپ ساحل پر کھڑے ہیں اور کشتی دریا میں ہے۔ ساحل پر سے آپ کشتی کی تعریف کریں کہ بہت خوبصورت کشتی ہے، تو یہ کیا کشتی پر بیٹھنا ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ نہیں، یہ کشتی پر بیٹھا نہیں ہے۔

اب دوسری بات، ساحل پر کھڑے ہی کھڑے کہنے لگیں کہ ہم اس کشتی کو بہت چاہتے ہیں اور دعوائے محبت صحیح بھی ہو، کیوں کہ اگر وہ کشتی قابل محبت ہے تو اس سے محبت ہونا چاہئے۔ یہ کوئی آپ کا کارنامہ نہیں ہے یہ اس کے حسن کا تقاضا ہے مگر محبت ساحل پر کھڑے کھڑے کشتی پر بیٹھنا تو نہیں ہے۔ اب اس کے بعد نازک تر منزل ہے کہ ساحل پر کھڑے ہیں اور کشتی بھنور میں پڑ گئی۔ باد مخالف کے تھپیڑے پڑنے لگے اور آپ اس کی بربادی پر آنسو بہانے لگے۔ یہ آنسو بھی بے قیمت نہیں ہیں۔ دردِ دل کی دلیل ہیں۔ محبت کا ثبوت ہیں مگر وہ بات اپنی جگہ پر قائم ہے کہ ساحل پر کھڑے یہ آنسو بہانا بھی کشتی پر بیٹھنا نہیں ہے۔ پھر کشتی پر بیٹھنے میں کیا ہوتا ہے؟

میری تو سمجھ میں یہی آتا ہے کہ کشتی پر جا کے بیٹھ گئے تو نہ ہماری ذاتی حرکت کچھ ہے، نہ ذاتی سکون، کشتی چلی تو ہم چلے، کشتی رکی تو ہم رُکے۔ بس اب کشتی اہلبیتؑ پر بیٹھنے کے معنی سمجھ میں آ گئے۔ وہ یہ ہیں کہ اپنے حرکت وسکون کو تابع اہلبیتؑ بنا دو جہاں اہلبیتؑ نے قدم آگے بڑھائے ہوں وہاں قدم آگے بڑھاؤ جہاں تک گئے ہوں وہاں قدم روک لو تو یہ ہے کشتی اہلبیت پر بیٹھنا۔ اس صورت میں جہاں کشتی پہنچے گی وہاں ہم پہنچیں گے اس لئے معصومؑ نے ارشاد فرمایا ہے:

فِیْ دَرَجَتِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ.

"ہمارے پیرو ہمارے درجہ میں ہوں گے قیامت کے دن۔"

آج کہا جاتا ہے کہ جب ہم محب اہلبیت اور مومن ہیں تو ہمیں عبادت واطاعت کی کیا ضرورت ہے؟

حالانکہ منزل محبت وایمان میں ہم بریر ہمدانی یا حبیب بن مظاہر یا مسلم بن عوسجہ کے برابر ہرگز نہیں ہیں۔ کربلا میں تو فرائض انسانی کے تمام شعبوں کو زندہ رکھا گیا، چنانچہ نماز جیسی کربلا میں پڑھی گئی ویسی کبھی نہیں پڑھی گئی۔ دیکھئے! غیر معصومین کا ذوق عبادت بھی کربلا میں کتنا بلند تھا۔ جنگ صفین میں حضرت علی ابن ابی طالب نماز پڑھ رہے ہیں اور تیر ادھر ادھر آکر گر رہے ہیں تو جناب ابن عباسؓ نے کہا کہ یہ نماز کا موقع ہے؟ حضرت علیؑ نے کہا کہ اے ابن عباس! اسی نماز کے لئے تو ہم جنگ کر رہے ہیں۔

یہاں امام کا عمل سامنے ہے۔ پھر بھی جناب ابن عباس حیرت سے سوال کر رہے ہیں۔ اب ذرا ابوثمامہ صائدی کا ذوق عبادت دیکھئے کہ تیروں کی بارش ہے، ہنگام جنگ ہے اور ادھر نگاہ آفتاب پر ہے فکر ہے کہ امام نہ کہنے پائیں اور ہم اپنے ذوق عبادت کا نذرانہ امام کی خدمت میں پیش کردیں۔ کہتے ہیں کہ مولا! تمنا یہ ہے کہ یہ نماز آپ کے ساتھ بجماعت ادا ہو جائے۔ ابوثمامہ کے کہنے پر امام دعائیں دیتے ہیں جیسے استاد شاگرد کے مکمل جواب پر خوش ہوکر دعائیں دے:

ذَکَرْتَ الصَّلٰوۃَ جَعَلَکَ اللّٰہُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ الذَّاکِرِیْنَ نَعَمْ ھٰذَا اَوَّلُ وَقْتِھَا.

تم نے خود سے نماز کو یاد کیا۔ اللہ تمہارا شمار نمازیوں اور یاد رکھنے والوں میں کرے۔

ہاں ہاں یہ اول وقت نماز ہے۔ یہ ہے نگاہِ غیر معصوم کی عصمت جس کی سند امام دے رہے ہیں۔

ظہر کی نماز کس طرح ہوئی۔ سعید وظہیر سامنے کھڑے ہیں۔ تیر آتے ہیں اپنے اوپر روک کر نماز مکمل کراتے ہیں۔ دو قربانیاں صرف نماز کے لئے [illegible]

جا رہے ہیں۔ کسی کو یہ سمجھنے کا حق نہیں کہ انھوں نے نہیں پڑھی، کون کہہ سکتا ہے کہ تیر کھانے کے لئے جھکے تو رکوع نہیں کیا اور سیدھے ہوئے تو قیام نہیں کیا اور اشاروں سے سجدے نہیں کر لئے۔ ہاں اس جماعت میں شریک نہیں تھے۔ ان کا بھی وہی ذوق عبادت تھا جو ابو ثمامہ کا تھا، مگر اطاعت وحفاظت امام مقدم تھی اور اب یہ فیصلہ کوئی نہیں کر سکتا، کہ ان کی نماز افضل ہے جو مولا کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے یا ان کی جو امام کے آگے کھڑے نماز پڑھنے کے ساتھ ساتھ امام کو نماز پڑھوا رہے تھے۔

ادھر امام نے سلام پھیرا اور سعید زمین پر گرے اور کہا:

اوفیتُ یا ابا عبد اللہ. مولا! کیا میں نے حق وفا ادا کر دیا۔

فرمایا: نعم وفیت جزاک اللّٰہُ خیراً. ہاں تم نے حق وفا ادا کر دیا۔ اللہ تمہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔

یہ نماز ظہر کا ذکر تھا...... بہت ممکن ہے کہ اسی وقت نماز عصر بھی بجماعت ادا ہوئی ہو کیونکہ سفر اور خوف میں باجماع امت جمع بین الصلوٰتین درست ہے۔ حضرت کے لئے اس وقت دونوں باتیں جمع تھیں۔ مگر ہمارے رہنمایان دین اور معصومینؑ بلاشبہ اوقات فضیلت پر الگ الگ نماز پڑھنے کے پابند تھے چنانچہ کتب مقاتل بتاتے ہیں کہ حضرت امام حسینؑ نے اس کے بعد آخری لمحۂ حیات میں نماز عصر ادا کی۔ مگر اس نماز کی پوری کیفیت بیان کرنے سے میری زبان قاصر ہے۔

بس اتنا کہوں گا کہ اب ذوالجناح کی پشت خالی ہو چکی تھی۔ اب راکبِ دوشِ رسولؐ زمین کے اوپر تھا۔ اس کے بعد نہ کہوں گا کہ رکوع کیونکر ہوا؟ قیام کس عالم میں ہوا؟ بس سجدہ کا ذکر اور اسی پر ختم مجلس۔ یقیناً علیؑ کا سجدہ بھی یادگار تھا۔ ۱۹؍ رمضان کی صبح کو جس کا گواہ بعد میں طلوع ہونے والا سورج تھا اور حسینؑ کا یہ آخری سجدہ ہے ۱۰؍ محرم کی عصر کا جس کا گواہ غروب کی طرف مائل ہوتا ہوا سورج ہے۔ مگر میں خود بارگاہ امیر المومنینؑ میں عرض کروں گا کہ یا علیؑ یقیناً آپ کی بھی نماز اور اس کا سجدہ یادگار ہے مگر آپ کو سجدہ سے سر اٹھانے کا موقع ملا۔ لیکن حسینؑ نے تو بس سر سجدہ میں رکھ دیا۔ وہ اس کے بعد بلند ہوا تو ظالموں کے ہاتھ سے نوکِ نیزہ پر۔

تیسری مجلس

مسئلہ حیات النبیؐ اور واقعہ وفات رسولؐ

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ

اَلحَمدُ لِلّٰہِ رَبِّ العَالَمِینَ. وَالصَّلوٰۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الاَنبِیَاءِ وَالمُرسَلِینَ

ابُو القَاسِمِ مُحَمَّدٍ خَاتَمِ النَّبِیِّینَ وَآلِہِ الطَّیِّبِینَ الطَّاهِرِینَ المَعصُومِینَ.

اَمَّا بَعدُ

فَقَد قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی فِی کِتَابِہِ المُبِینِ وَھُوَ اَصدَقُ الصَّادِقِینَ

اِنَّکَ مَیِّتٌ وَاِنَّھُم مَیِّتُونَ.

خالق اپنے رسولؐ سے خطاب کر کے ارشاد فرمارہا ہے کہ یقیناً آپ .... بھی موت سے دوچار ہونے والے ہیں اور یہ جتنے اور لوگ ہیں یہ سب بھی موت سے دوچار ہوں گے۔

اس آیت کے مضمون سے متعلق سب سے پہلے یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ مسلمان اکثریت کے درمیان ایک مہتم بالشان اختلافی مسئلہ حیات النبیؐ اور موت النبیؐ کا ہے اور میں نے ''مسلمان اکثریت اس لئے کہا کہ میں مسلمانوں کے جس اقلیتی گروہ سے تعلق رکھتا ہوں اس میں یہ مسئلہ اختلافی نہیں ہے۔

برادران اہلسنت میں جو لوگ یہاں موجود ہیں اس سے واقف ہوں گے کہ یہ مسئلہ بہت عظیم الشان مبحث بن گیا ہے جس میں باہمی مناظرے تک ہوتے ہیں اور طرفین سے رسالے ردّ وقدح میں شائع ہوتے ہیں کہ کچھ علماء حیات النبیؐ کے قائل

اس کی رد کرتے ہیں ایک طبقہ عوام کا وہ ہے جس نے اس مسئلہ کو جیسا میں نے بعض پوسٹروں میں دیکھا پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے القاب میں داخل سمجھا ہے مثلاً سیرۃ النبیؐ کا جلسہ ہوگا، اسے یوں لکھتے ہیں کہ یہ جلسہ حیات النبیؐ کے ذکر مقدس کا ہے۔

میں نے جو کہا ہے کہ ہمارے درمیان اختلاف نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس بارے میں حیات النبیؐ والے گروہ ہی سے اتفاق رکھتے ہیں اور وہ ہمارے یہاں کوئی اختلافی بات بھی نہیں ہے تو اب سوال یہ ہے کہ یہ قرآن تو تمام مسلمانوں میں متفق علیہ ہے۔ کوئی حدیث ہے تو قابل اختلاف ہو سکتی ہے یعنی اس میں قوی یا ضعیف کی بحث ہو سکتی ہے مگر قرآن میں تو مسلمانوں کے درمیان اس طرح کے کسی اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔

پھر کیا وجہ ہے کہ جو چیز قرآن میں درج ہے، اس میں مسلمانوں کے دو قول ہو گئے۔ میں نے آیت ابھی پڑھی جس کے معنی یہ ہیں کہ آپ بھی میت ہیں یعنی مرنے والے ہیں اور آیت قرآن کے ترجمے میں بھی کوئی اختلاف نہیں پھر حیات النبیؐ و موت النبیؐ کا مسئلہ محل اختلاف کیوں ہے؟

ظاہر ہے کہ نقطۂ اختلاف کوئی ایک ہے اور نقطۂ اتحاد کوئی دوسرا ہے لازماً اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ حیات و موت کے کوئی دو مفہوم ہیں کہ ایک معنی سے موتِ رسولؐ متفق علیہ ہے اور ایک موت محل اختلاف ہے جس کے مقابلہ میں ہم حیات النبیؐ کے قائل ہیں۔

یاد رکھنا چاہئے کہ موت کی لفظ جب ہم کہتے ہیں تو ایک معنی اس کے ہیں کمالاتِ حیات کا ختم ہونا۔ حیات کا خاصہ جو کمال انسانی کا ایک اہم جزو ہے کیا ہے؟ شعور و ارادہ اور حرکت و عمل تو جو موت النبیؐ کا قائل ہے وہ یہ کہتا ہے کہ جیسے کوئی بھی مرنے والا دنیا سے چلا گیا تو اس کو اس دنیا کی باتوں کی خبر نہیں ہے اور اس دنیا سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

اسی طرح پیغمبرؐ بھی جب دنیا سے اٹھ گئے تو اب نہ ہمارے اعمال و افعال کی انھیں اطلاع ہے، نہ اب ہمیں کوئی مدد پہنچا سکتے ہیں۔ اور نہ ہم تک کوئی فیض رسانی کر سکتے ہیں۔ جس کا یہ

ہے اور اس کے بالمقابل جو حیات النبیؐ کا قائل ہے، وہ کہتا ہے کہ اس تصور ہو وہ موت النبیؐ کا قائل ہے اور اس کے بالمقابل جو حیات النبیؐ کا قائل ہے، وہ کہتا ہے کہ اس دنیا سے اٹھ تو گئے مگر اس دنیا سے اٹھنے کے بعد بھی ان کے تعلقات ہم سے شعور و حرکت کے لحاظ سے ختم نہیں ہوئے ہیں۔ اب بھی ہماری صدا وہ سنتے ہیں۔ اب بھی وہ ہماری پکار پر لبیک کہہ سکتے ہیں۔ ہم ان سے التجا کریں تو وہ اللہ سے التجا کر کے ہماری مشکل کو حل کرا سکتے ہیں۔ جو اس کا قائل ہے وہ حیات النبیؐ کا قائل ہے۔

دوسرا مفہوم ہے موت کا جسمانی زندگی کے لحاظ سے وہ موت جس کے اعتبار سے شرع میں احکام اموات مرتب ہوتے ہیں۔ اس مفہوم کے لحاظ سے قرآن کہہ رہا ہے۔

''آپ بھی یقیناً مرنے والے ہیں'' تو اب کون مسلمان ہوسکتا ہے جو اس کا قائل نہ ہو۔ کوئی قرآن کا ماننے والا، القرآن کتابی کا اعلان کرنے والا یعنی قرآن کو کتاب الٰہی ماننے والا کیونکر اس کا منکر ہوسکتا ہے اور پھر چاہے مجھے مسلمانوں کے خاص اختلافی مسائل پر کوئی تبصرہ منظور نہ ہو مگر؟ بنیادی طور پر اختلاف ہے، وہ سب کو معلوم ہے تو میں کہتا ہوں کہ اگر موت النبیؐ اس معنی سے ثابت نہ ہوتی تو خلافت کی بحث ہی کیوں اٹھتی؟ اگر وفات رسولؐ مسلم نہ ہوتی تو میراث رسولؐ کا سوال کیوں پیدا ہوتا؟ اگر موت کا تصور نہ ہوتا تو غسل میت کیوں ہوتا؟ اگر موت کا تصور نہ ہوتا تو قبر رسولؐ کا کیا سوال تھا؟ روضۂ رسولؐ کیوں بنتا؟ حج کے پہلے یا بعد زیارت کے کیا معنی ہوتے؟ معلوم ہوتا ہے کہ وہ موت اختلافی نہیں ہے۔ وہ کوئی دیوانہ مسلمان ہوسکتا ہے جو قرآن کو مانتے ہوئے بھی اس موت کا منکر ہو۔

وہ حیات النبیؐ جس پر میرا ایمان ہے اور بہت سے مسلمان اسے مانتے ہیں، وہ موت کے پہلے مفہوم کے مقابلہ میں ہے۔ کوئی کہے کہ جو تشریح کی گئی حیات اور موت کی، یہ تو بالکل نئی بات ہے۔ حیات اور موت کے معنی تو بس وہی ہیں یہ کہ موت کے معنی ہیں علم و شعور اور حرکت و عمل کا ختم ہونا اور حیات کے معنی ہیں ان کمالات کا قائم رہنا۔ یہ تو ایک نئے معنی حیات اور موت کے ہیں تو

میں کہتا ہوں کہ ایک نقطہ اجماع واتفاق تمام مسلمانوں کا یاد دلاؤں تو ماننا پڑے گا کہ یہ میری ایجاد نہیں ہے۔ دیکھئے اللہ کے صفات ثبوتیہ جو بچوں تک کو پڑھائے جاتے ہیں، ان میں عالم وقادر وغیرہ کے ساتھ "حی" ہے حی کے کیا معنی؟ زندہ۔ تو کیا اس زندگی کے معنی جسم وروح کے باہمی تعلق کے ہیں؟ اس صورت میں تو خالق مرکب ہو جائے گا۔ پھر حی کی صفت توحید سے ٹکرائے گی۔ وہاں نہ جسم ہے نہ جسمانی روح تو پھر حیؑ کے کیا معنی؟ تو علمائے کلام لکھتے ہیں کہ حیؑ کا مفہوم درحقیقت مجموعہ ہے عالم وقادر کے مفہوموں کا۔ جب انھیں الگ الگ کر کے کہتے ہیں تو صفتیں بنتی ہیں، عالم اور قادر اور جب ان دونوں کو سمو کر کہتے ہیں تو حیؑ ہو جاتا ہے۔ تو اب آپ سمجھے کے علم وقدرت جس میں قائم ہوا اسے کہتے ہیں حیؑ۔ اب میں کہتا ہوں کہ جس معنی میں عالم وجوب میں، وہ حیؑ ہو۔ اس معنی میں عالم امکان کے بعد وفات پیغمبرؐ حیؑ میں تو اب بڑا ہولناک جملہ کہوں گا اور کسی فتوے سے نہیں ڈروں گا وہ یہ ہے کہ پیغمبرؐ جب اس دار دنیا میں تھے تو حیات میں ہمارے شریک تھے اور بعد وفات حیات میں اس کے شریک ہو گئے۔ میں نے کہا کسی فتوے سے نہیں ڈروں گا۔ حالانکہ شرک سے یقیناً میں بھی ڈرتا ہوں اور ڈرنا چاہئے مگر شرک سے ڈرتا ہوں۔ الزام شرک سے نہیں۔ یہ جو میں کہہ رہا ہوں کہ اس کے شریک ہو گئے تو اگر یہ سمجھوں کہ بذات خود شریک ہوئے اور اس کے مدمقابل ہو گئے تو یہ بلا شبہ شرک ہے اور جب اس نے یہ صفت دی تو شرک کہاں رہا۔

ظاہر ہے کہ ایسا مہتم بالشان مسئلہ جس پر میں نے کہا۔ طرفین سے یہ کتابیں لکھی جاتی ہیں، اس کو میں مختصر وقت میں اور وہ بھی بطور تمہید پوری طرح کہاں پیش کر سکتا ہوں۔ پس آخر میں ایک معجزۂ رسولؐ جو متفق علیہ ہے پیش کردوں۔ ایک تمہید کے ساتھ اور وہ تمہید یہ ہے کہ ازروئے قرآن موت کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ قبض روح جو موت کی خصوصیت ہے وہ ہر انسان کے لئے روز ہوتی ہے۔ یہ نیند ہماری کہ ہم سوتے ہیں ازروئے قرآن اس میں بھی قبض روح ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں ھُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰکُمْ بِالَّیْلِ یہ وہ ہے جو رات کے وقت تمہیں وفات دیتا ہے، اس سے

اگر وہ سی موت مراد ہو؟ تو اس میں رات کی قید کیا۔ دوسری جگہ ذرا تفصیل کے ساتھ موت اور نیند دونوں کے اتحاد اور فرق کو نمایاں کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اَللّٰهُ الَّذِیْ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِهَا فَیُمْسِکُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْهَا الْمَوْتَ وَیُرْسِلُ الْاُخْرٰی اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی. (سورہ زمر: ۴۲)

''اللہ وہ ہے جو تمام جانوں کو لے لیتا ہے۔ ان کے مرنے کے وقت اور جو نہ مریں تو ان کے سونے کے عالم میں تو روک لیتا ہے اسے جس کے مرنے کا فیصلہ ہو گیا ہے اور جسے دنیا میں ابھی رکھنا ہے اسے واپس کر دیتا ہے ایک مقررہ مدت تک کے لئے۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ وفات یعنی قبض روح روز ہوتی ہے۔ ہم ایک صورت سے روز مرتے ہیں مگر یہ موت اصغر ہے۔ اب وہ متفقہ معجزۂ رسول کا ملاحظہ ہو۔ وہ یہ ہے کہ حضرت نے فرمایا میں سوتے میں بھی تمہیں اسی طرح دیکھتا ہوں جس طرح جاگتے میں دیکھتا ہوں۔ تو اب مجھے کوئی منطق و فلسفہ درکار نہیں ہے۔ ایک جملہ میں منزل استدلال کو طے کر کے آگے بڑھوں گا۔ یاد رکھئے جس کا خواب مثل بیداری ہوگا اس کی موت بھی مثل حیات ہوگی۔

اس عالم امکان میں موت جسمانی کے باوجود حیات کا ثبوت قرآن سے موجود ہے جو سب کے نزدیک مسلم ہے۔ وہ حیات شہداء ہے۔ شہداء کی حیات کیا اس معنی میں ہے کہ وہ اس موت سے بری ہیں جس معنی میں رسولؐ سے کہا گیا ہے۔ اِنَّکَ مَیِّتٌ یعنی موت جسمانی، تو اس موت سے شہداء بری ہوتے تو میراث کسی شہید کی تقسیم نہ ہوتی۔ اس موت سے بری ہوتے تو شہید کے لئے غسل نہ سہی، کفن نہ سہی مگر نماز جنازہ بھی کیوں پڑھی جاتی۔ دفن کیوں کیا جاتا۔ کسی شہید کی بیوہ کو پھر حق نہ ہو عقد ثانی کرنے کا۔ ان مسلمہ احکام شریعت اسلام سے ظاہر ہے کہ اس موت سے شہداء بھی بری نہیں ہیں۔ پھر بھی قرآن کیا کہہ رہا ہے:

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا.

جو اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں، "انھیں مردہ نہ سمجھو"

بَلْ اَحْيَاءٌ. بلکہ وہ زندہ ہیں اور صرف اَحْيَاءٌ مجمل طور پر کہہ کے بات ختم نہیں کی بلکہ لوازم حیات بھی ثابت کئے ہیں کہ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ. زندہ ہیں، اپنے پروردگار کے یہاں رزق حاصل کرتے ہیں۔

اب ایک طبقہ ہے مسلمانوں میں جو فاتحہ اور نیاز وغیرہ سب کے بارے میں اس طرح سوال کرتا ہے کہ کیا مردہ کھاتا ہے؟ میں کہتا ہوں اگر کھاتا نہ ہو تو خدا کیوں کہتا: "عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ" اپنے پروردگار کے یہاں رزق حاصل کرتے ہیں۔ اب کوئی کہے کہ آیت قرآن کی بنا پر ہم مانے لیتے ہیں کہ وہ کھاتا ہے۔ لیکن یہ کھانے تھوڑی کھاتا ہے جو ہم سینی میں لگا کر رکھتے ہیں تو ان کھانوں کا رکھنا تو بہرحال بیکار ہے اس کے جواب میں مجھے ماضی قریب اور حال کے ان مشکلات پر نظر کرنے کی دعوت دینا ہوگی جن کی وجہ سے ایک ملک کا روپیہ دوسرے ملک میں نہیں جاسکتا۔ مگر انسانی حالات کی بنا پر اکثر ضرورت منتقلی زر کی رہتی ہے۔ کسی گھر کا باپ یہاں، بیٹا وہاں ہے کسی کی ماں یہاں ہے، بیٹا وہاں ہے، خصوصیت سے یہ صورت ہمارے ملک کی تقسیم کے بعد پیدا ہوئی ہے۔ گھرانے بٹ گئے، گھر بٹ گئے، اس طرح اکثر کمانے والے وہاں گئے، کھانے والے یہاں رہ گئے۔ وہ چاہتا ہے بھیجنا مگر قانونی رکاوٹیں سدّ راہ ہیں۔ تو میں کوئی غیر قانونی ذریعہ تھوڑی بتاؤں گا۔ حالانکہ لوگ سیکھے ہوئے ہیں، میرے سکھانے کی حاجت کہاں ہے؟ مگر بالکل قانونی صورت ایک مجھے معلوم ہے۔ ان ملکوں میں جن سے مواصلاتی تعلقات قائم ہوں۔ ایسے بینک ہیں جو دونوں ملکوں سے رابطہ رکھتے ہیں۔ وہاں ایک فارم کی خانہ پری کر کے داخل کیا جائے۔ وہاں سے اجازت نامہ مل جائے گا کہ وہ بینک آپ سے روپیہ لے کر وہاں بھیج دے۔ اب ہمارے یہاں کے نوٹ اگر وہاں بھیجے جائیں تو اس ملک میں چل نہیں سکتے۔ لہٰذا آپ بینک میں اپنے یہاں کے نوٹ داخل کریں گے اور وہ امانت داری کا فرض ادا کرنے کے لئے وہاں کے نوٹوں کی شکل میں اس تک

پہنچائے گا۔ جسے ہم نے بھیجا تھا۔ بس اسی طرح یاد رکھئے کہ ہمارے بس میں وہاں کی غذائیں نہیں ہیں، ہم تو وہی اپنی یہاں کی غذائیں پیش کرتے ہیں مگر عالم الضمائر خدا ہماری غذاؤں کو ہم سے لے کر امانت داری کے ساتھ وہاں کی مناسب حال غذاؤں کی شکل میں بدل کر پہنچا دیتا ہے۔

بہر حال سابق بیان سے ظاہر ہو گیا کہ حیات جسمانی اور اس کے مقابل کی موت اور ہے اور حیات بمعنی بقائے کمالات زندگی اور اس کے مقابل کی موت اور ہے۔ اب یاد رکھنا چاہئے کہ یہ موت جو سلب کمالات کے معنی میں ہے، اس سے اگر ہم ایمان کے جادہ پر قائم ہیں تو ہمیں سابقہ ہی نہیں پڑتا ہم جس کا چالیسواں کر رہے ہیں، اسے بھی اس معنی میں نہیں سمجھتے کہ مر گیا ہے۔ وہ جس کے لئے عزیز و احباب گریاں ہوتے ہیں، وہ بھی اس موت پر نہیں روتے اس لئے کہ ہمارے پیغمبرؐ کی حدیث ہے اور وہ حدیث بھی ایسی ہے جس کو امام فخر الدین رازی تفسیر کبیر کے ڈیڑھ صفحہ میں درج کیا ہے اس کا یہ ایک جملہ ہے جو ہم میں سے بہت سے افراد کو بفیض مجالس حفظ ہوگا۔

مَنْ مَاتَ عَلٰی حُبِّ اٰلِ مُحَمَّدٍ مَاتَ شَهِیْدًا.

جو محبت آل رسولؐ میں دنیا سے اُٹھا، وہ شہید دنیا سے گیا۔

اب غور کیجئے کہ کیا یہ کسی تاریخی واقعہ کا بیان ہے کہ جو محبت آل رسولؐ میں مرا وہ ضرور کسی میدان جنگ میں گیا ہوگا اور ضرور وہاں تلواریں کھائی ہوں گی صاف ظاہر ہے کہ یہ تاریخی واقعہ کا بیان نہیں ہے۔ یہ حقیقت میں معانی بیان کے لحاظ سے استعارہ ہے۔ جس کی بنیاد تشبیہ پر ہوتی ہے۔ تشبیہ میں جو نمایاں صفت مشبہ بہ کی ہوتی ہے وہ مشبہ میں ظاہر کی جاتی ہے۔ تو جناب! اب شہادت کی نمایاں صفت وہ ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں کیا گیا ہے۔ یعنی حیات جاودانی تو یہ جو کہا گیا کہ مَنْ مَاتَ عَلٰی حُبِّ اٰلِ مُحَمَّدٍ مَاتَ شَهِیْدًا. اس کے معنی یہ ہیں کہ چاہے وہ بستر پر دنیا سے گیا ہو لیکن پھر بھی یہ نہ سمجھو کہ وہ مر گیا بلکہ جیسے شہید کو حیات جاودانی ہے، اسی طرح اس کے لئے بھی حیات جاودانی ہے۔

اب میں مجالس سوم و چہلم میں میت کا ذکر کرنے کا تو عادی نہیں ہوں اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ مقصد مجلس اس تذکرہ سے پورا نہیں ہوسکتا اور پھر یہ مرحوم کہ شرکائے مجلس میں زیادہ تر لوگ وہ ہیں جو ان کی سیرت کا مجھ سے زیادہ قریب سے مطالعہ کئے ہوئے ہیں مگر یہ تمام حضراتِ شعراء نے بھی اپنے منظوم تاثرات میں ان کی خصوصیت ظاہر کی ہے کہ عزائے سید الشہداءؑ کا انھیں بھی ذوق وشوق بحد عشق تھا۔ اور اپنے محدود تعلقات کے حدو میں مجھ کو بھی اس کا ذاتی مشاہدہ ہے کہ وہ سادگی کے ساتھ اپنے کندھے پر تولیہ ڈالے ہوئے لکھنؤ میرے پاس پہنچتے رہتے تھے مجلس کا وعدہ لینے کے لئے حالانکہ تنفس کے مرض کی زیادتی اب ہوئی تھی مگر اس وقت بھی پہنچتے تھے تو جیسے ہانپتے ہوتے تھے۔ اور اگر مجھے کبھی عذر ہوا تو بلا تکلف اور بغیر اصرار فوراً بے نیل ومرام واپس گئے، یہ جانتے ہوئے کہ عذر معقول یقیناً ہے لہٰذا اصرار سے فائدہ نہیں ہے اور جب موقع ہوا تو میں نے وعدہ کرلیا۔ ظاہر ہے کہ میرے یہاں اس ذوق وشوق کے ساتھ پہنچنے سے ان کا کیا فائدہ تھا؟ صرف یہ کہ میں ان کے یہاں آکر ان ہستیوں کا ذکر کروں جن کے تذکرے کے وہ مشتاق تھے تو اس لئے مجھے یقین ہے کہ اپنی مجلس میں اپنے ذکر کو وہ خود اتنا پسند نہیں کریں گے جتنا کہ معصومین کے ذکر کو جن کے ذکر کو وہ اپنا نصب العین بنائے ہوئے تھے لہٰذا ان کا تذکرہ کرنا نہیں ہے مگر اتنا کہ جب وہ محبت اہلبیت جس پر ان کا کردار گواہ ہے تو ہمارے نزدیک وہ بھی زندہ ہیں۔

اب یہاں پر ایک سوال اٹھتا ہے کہ اگر ہم سمجھتے ہیں کہ وہ مرے نہیں ہیں تو پھر روتے کیوں ہیں۔ ہاں یہ ویسا ہی سوال ہے جیسے شہداء کے بارے میں کہا گیا ہے

روئیں وہ جو قائل ہوں ممات شہداء کے ہم زندۂ جاوید کا ماتم نہیں کرتے

اس وقت کسی منطقی وفلسفی بیان کا اس موضوع پر موقع نہیں مگر ایک روزمرہ کی مثال آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں جو موضوع مجلس کے لحاظ سے تو گویا ایک متضاد موقع کی مثال ہے۔ لیکن میرے مقصد کے لحاظ سے نہایت قریب اور ذہن کو حقیقت سے قریب لانے والی مثال ہے۔ آج

کل شرفاء کے طبقہ میں کتنے ہیں جن کے سامنے مسئلہ لڑکی کی شادی کا نہ ہو لڑکی کی شادی نہ ہونا شرفاء کے طبقہ کے لئے ایک مہم بن گئی ہے تو جب تک شادی نہیں ہوتی اور دیر ہو رہی ہے۔ ماں باپ اور عزیزوں پر کیا گذرتی ہے؟ شب و روز فکر، کوشش اور کاوش۔ اب جناب! خدا نے وہ دن دکھلایا تو رخصتی کے وقت کون معتدل فطرت کے ماں باپ ہیں جو رو نہ رہے ہوں؟ اب تو سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ رونا اس کی دلیل نہیں ہے کہ مرنے کا رونا ہے۔

نہیں جدائی پر بھی رونا ہوتا ہے۔ دوستوں کو غم یہ ہے کہ ایک دوست پرانا جو ہمارے ساتھ روز رہتا تھا، چلا گیا، بچوں کو غم ہے کہ باپ کی شفقت جو تھی اس سے ہم محروم ہو گئے اور عزیز جو ہیں جس میں جو رشتہ ہو۔ میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ شخصیت ایک اٹھتی ہے مگر پسماندگان میں سے ہر آدمی کے لحاظ سے ایک مستقل سانحہ ہوتا ہے۔ اس طرح موت ایک آدمی کی ہوتی ہے مگر سانحے بہت سے ہوتے ہیں۔ ایک بھائی سے بھائی جدا ہو گیا۔ یہ ایک سانحہ ہے۔ اولاد کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا۔ یہ ایک سانحہ، اگر بیوی موجود ہو تو اس کا شریک حیات، رفیق زندگی، سرتاج اٹھ گیا یہ ایک سانحہ ہے تو ہر ایک فرد کے لحاظ سے سانحوں کی تعداد بڑھتی ہے۔

اب جس کے برکات و فیوض کا تعلق جتنا وسیع ہو، سانحوں کی تعداد اس ایک ذات کے اٹھنے سے اتنی زیادہ ہوگی تو یہ رونا اس کا ہوتا ہے۔ مرنے پر تھوڑی ہوتا ہے تو جس کی مجلس ہم کرتے ہیں، فاتحہ دلاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مجلس ماتم ہم کسی غیر کا نہیں کرتے، اسی کا کرتے ہیں جو محبت اہلبیتؑ ہے اور جو ہر ایمان رکھتا ہے تو ہم اس کو مردہ نہیں سمجھتے۔ بس وہ ہمارے درمیان سے اٹھ گیا اسی لئے ہمارا اردو کا محاورہ یہاں بالکل حقیقت کے مطابق ہے کہ ہم موت کو انتقال کہتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہمارے محفل سے چلا گیا چاہے اپنے نقطۂ نظر سے بہتر محفل میں گیا ہو۔ اس لئے اسے غم نہیں ہوتا، ہمیں ہوتا ہے۔ وہ شاید دنیا سے جاتے وقت ہنس رہا ہو لیکن ہم رو رہے ہیں۔ اور خوش نصیب وہ ہے جو خود ہنستا ہوا جائے اور دوسروں کو روتا ہوا چھوڑے اور یہی آدمی کی خوبی ہے کہ

جانے پر وہ خود خوش ہو اور لوگ غم کریں لیکن وہ موت جس کو میں نے موت عنصری کہا اس کے لئے قرآن کہہ رہا ہے اپنے رسولؐ سے کہ

اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ.

جیسے سب دنیا کے جانے والے ہیں، آپ بھی دنیا سے جائیں گے ضرور اور یہ قرآن کی وہ آیت ہے جس کی بنا پر ہمارے شاعر نے بھی کہا ہے:

''جب احمد مرسل نہ رہے، کون رہے گا''

قرآن حبیب الٰہی سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے اور یہ وہ چیز ہے جس کی بناء پر میں اس آیت کو ایک غلط تصور کے دفعیہ کے لئے پیش کرتا ہوں وہ ایک غلط جذبہ ہم میں ہے جو نہ جانیں کس کس غلط ماحول میں رہنے کی وجہ سے پیدا ہو گیا ہے کہ ہم موت کو بری چیز سمجھتے ہیں یعنی آپ کتنے ہی استعارے سے اور مجاز کے پردے ڈال کر کہئے کہ جب آپ مریئے گا تو تیوریوں پر بل آ جائیں گے۔ چاہے عمر کی کسی منزل میں ہوں۔ خود کتنی دفعہ کہتے ہوں کہ اب قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ لیکن دوسرا جب کہے تو ناگوار ضرور ہوگا۔ اور اگر ایسا بے درد ہے کہ بغیر استعارہ اور کنایہ کے کہہ دیا تو بدتمیز کا لقب مل جائے گا۔

بھلا ہم اور ہمارے مرنے کا ذکر ہمارے منھ پر! یہ تو میری ایسی عمر کے لوگوں کا حال ہے جو بزرگان روزگار میں شامل ہو چکے ہیں اور کہیں کوئی بڑا بھائی اپنے چھوٹے بھائی سے کہہ دے کہ جب تم مرو گے اور کہیں باپ بیٹے سے یوں کہہ دے تو سب یہ کہیں گے کتنا بے درد ہے، بے رحم ہے تو اب دیکھئے کہ یہ جو ہماری ذہنیت ہے، کتنی غلط ہے، خالق سے بڑھ کر بھی کوئی معیار تہذیب کو جانتا ہے؟ مگر خالق کسی اور سے نہیں۔ اپنے حبیب سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے۔ بغیر کسی مجاز کا پردہ ڈالے ہوئے منھ در منھ خود اس سے خطاب کر کے اِنَّکَ مَیِّتٌ یقیناً آپ مرنے والے ہیں اب اس کے بعد اگر ہماری ذہنیت ایسی ہو تو کیا یہ ذہنیت اسلامی ہے؟

اور اب عقلی طور پر اس تصور کا جائزہ لوں یوں کہ موت اگر برائی ہے تو کس کے لئے برائی ہے؟ جانے والے کے لئے برائی ہے، اس لئے ہم اپنی نسبت یہ کہنا برا سمجھتے ہیں کہ جب آپ جائیے گا یا جو رہ گئے یعنی وہ عزیز جن سے مرنے والے کی جدائی ہوئی ان کے لئے برائی ہے۔ آخر کس کے لئے برائی ہے؟ جو بھی شق تیار کیجئے، میں کہوں گا کہ اگر وہ برائی ہوئی تو خالق اپنے حبیب سے اسے گوارا نہ کرتا۔ کیونکہ کوئی اپنے دوست کے لئے برائی پسند نہیں کرتا۔ ہم بھی اپنے دوست کے لئے برائی گوارا نہیں کرتے۔ لیکن ہم عاجز ہیں۔ بغیر ہمارے اختیار کے کچھ صدمے اس کو پہنچ جاتے ہیں۔ مگر جو قادر مطلق ہو اور قضا پر اس کا قابو ہو، وہ آخر خضرؑ کو زندہ رکھ سکتا ہے، الیاسؑ کو زندہ رکھ سکتا ہے تو اپنے حبیب کو وہ چاہتا اور وہ موت کو برائی سمجھتا ہے تو اس برائی سے روشناس کیوں کراتا اور تمام سلسلۂ انبیاء میں یہ ہمارے رسولؐ کی خصوصیت ہے کہ انھیں اللہ نے حبیب کا درجہ عطا کیا اور یہ حضرت ابراہیمؑ کے درجہ خلت سے بڑا مرتبہ ہے اس لئے کہ اردو میں تو ترجمہ خلیل اللہ اور حبیب اللہ دونوں کا ایک ہوتا ہے اللہ کا دوست، لہٰذا ہماری سمجھ میں فرق کچھ نہیں آتا ہم سمجھتے ہیں، وہ خلیل اللہ ہیں، یہ حبیب اللہ ہیں۔ وہ بھی اللہ کے دوست یہ بھی اللہ کے دوست تو اس میں خاص رفعت کیا ہوئی مگر یہ عربی زبان سے ناواقف ہونے کا نتیجہ ہے۔ عربی زبان کے لحاظ سے دونوں کے معنی اگرچہ دوست کے ہیں مگر خلیل اور حبیب کے معنی میں فرق ہے۔ خلیل کے معنی میں مضمر ہے طالب ہونا اور حبیب کے معنی میں مضمر ہے مطلوب ہونا۔ خلیل وہ ہے جو دوسروں کو چاہتا ہو اور حبیب وہ ہے جس کو دوسرا چاہے۔ خلیل اللہ کے معنی ہیں محب خدا اور حبیب اللہ کے معنی محبوب خدا۔ اب اہل دل سمجھ سکتے ہیں کہ زمین محبت کس آسمان پر پہنچ گئی۔ ایک وہ دوست جو خود طلبگار ہو اور ایک وہ جس کے آپ طلبگار ہوں، ان کے برتاؤ میں بھی بڑا فرق ہوتا ہے۔

اس کی روزمرہ کی زندگی میں ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ حضور! فرض کیجئے آپ نے ماشاء اللہ ایک مکان بنایا جیسے ہمارے وصی بھائی مرحوم نے یہ عالی شان مکان تعمیر کیا تو اگر کوئی صاحب

ہوتے، جنھیں آپ سے تعلقات بڑھانے منظور ہوتے، کسی وجہ سے چاہے وقتی طور پر الکشن کی ضرورت سے تو وہ اس طرح کہتے کہ سنا ہے، ماشاء اللہ آپ نے ایک عالیشان مکان تعمیر فرمایا ہے دل چاہتا ہے ہم بھی دیکھیں۔ یعنی مکان بنوایا آپ نے اور دل ان کا چاہنے لگا دیکھنے کو اور آپ کہتے ہیں کہ جناب میں تو گھر پر کم رہتا ہوں۔ کہا جس وقت آپ فرمایئے، اس وقت میں حاضر ہو جاؤں۔ آپ نے فرمایا اچھا صاحب اس دن اس وقت آ جایئے گا۔ اب بالکل وقتِ معین پر وہ حاضر ہو گئے تو آپ جیسے بھولے ہوئے ہیں۔ کہا آپ کیسے تشریف لائے۔ جواب ملا میں نے کہا تھا کہ آپ نے ماشاء اللہ جو مکان بنوایا ہے، اس کو دیکھنا چاہتا ہوں آپ نے کہا۔ اچھا صاحب، چلیئے اگرچہ وقت کم ہے۔ لے گئے ادھر اُدھر سے مکان کچھ دکھا دیا اور کہا بس ملاحظہ فرمالیا، تشریف لے چلئے۔ یہ ہو گا وہ دوست جو طالب ہے اور اگر کوئی صاحب ایسے ہیں کہ کسی وجہ سے بانی مکان ان سے تعلقات بڑھانا چاہتے ہیں تو وہ ملیں گے کہ میں نے ایک چھونپڑا بنایا ہے۔ جی چاہتا ہے آپ ملاحظہ فرمالیں اور اب وہ فرماتے ہیں مجھے فرصت کم ہوتی ہے اور یہ کہتے ہیں ارے جس وقت فرمایئے میں سواری بھیج دوں۔ اب وقت معین پر سفیر خاص مرکب خاص لئے ہوئے حاضر اور اب جیسے یہ سوئے ہوئے ہیں، محبت کے تقاضوں سے کون صاحبِ دل واقف نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کوئی طلبگار رہتا تو سوتا کیوں ہوتا، ٹہلتا ہوتا اب ان کی نیند بے چین کی گئی، اٹھائے گئے کہا کیسے آئے کہا جی بلایا ہے۔ سواری بھیجی ہے اچھا صاحب؟ پھر چلتے ہیں۔ اب پہنچے اور کہاں تک پہنچے۔ میں جہاں پہنچا نہیں ہوں تو اسے میں کیونکر بتاؤں۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ وہاں تک پہنچے جہاں تک جانے کے تصور سے فرشتہ کے پر جلتے ہیں اور اب یہ ہیں کہ وہاں پہنچ کر ہر قدم پر رکے جاتے ہیں اور ادھر سے کہا جا رہا ہے کہ اور بڑھئے۔ اب پہلے تو میرا بیان عام انداز میں تھا کہ آپ کی بنوائی ہوئی عمارت ہے اور آپ کا دوست اس کے دیکھنے کی خواہش کرتا ہے یا آپ اپنے دوست کو اس کے دیکھنے کے لئے بلواتے ہیں۔ مگر انبیاء و مرسلین کی منزل میں میرا بیان بالکل بے

قیمت ہے اگر کوئی قرآنی شاہد نہ پیش کرسکوں تو اب سنئے کہ قرآن کہہ رہا ہے: سُبحَانَ الَّذِیٓ اَسریٰ بِعَبدِہٖ ''پاک ہے جو لے گیا اپنے بندہ کو'' پھر بدقسمتی سے مسلمانوں کے درمیان ایک اختلافی بات یاد آگئی۔ مسلمانوں میں اختلاف ہے کہ رسول کو معراج جسمانی ہوئی یا روحانی؟ میں کہتا ہوں کہ معراج کے ماننے کی ضرورت کیا ہے؟ یہی نہ کہ قرآن میں موجود ہے اسی لئے کسی غیر مسلم کو ہم معراج نہیں منوائیں گے۔ اس رسالت پر بحث کریں گے انھوں نے رسول کو رسولؐ مانا ہی نہیں۔ نہ قرآن کو کلام اللہ مانتے ہیں تو ان سے معراج کے مسئلہ پر کیوں گفتگو کریں۔ مگر مسلمان، جب اس نے رسالت مان لی ہے، قرآن کو کلام خدا مان لیا ہے تو اب مسلمان سے گفتگو کا محل ہے کہ جب معراج کو اس لئے مانا ہے کہ قرآن میں ہے۔ تو اب جو قرآن میں ہو، وہ ماننئے، ورنہ بے اصولی ہے۔ قرآن کہہ رہا کہ ہے کہ پاک ہے وہ پروردگار جو لے گیا، اپنے بندہ کو۔ اب بندہ اگر بحالت حیات نام فقط روح پر ہوتا ہو تو مانئے کہ روح گئی اور اگر بندہ نام روح و جسد کے مجموعہ کا ہے تو پھر مانئے کہ پیغمبرؐ اپنے جسم سمیت معراج میں تشریف لے گئے۔

ہاں پھر سنئے: اَسریٰ بِعَبدِہٖ ''لے گیا اپنے بندہ کو'' کہاں سے لے گیا؟ مِنَ المَسجِدِ الحَرَامِ ''مسجد محترم سے'' کہاں تک لے گیا اِلَی المَسجِدِ الاَقصَی الَّذِی بَارَکنَا حَولَہٗ.

اس بلند ترین مرکز مسجود تک جس کے گردو پیش برکت ہی برکت ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ کیوں لے گیا؟

لِنُرِیَہٗ مِن اٰیٰتِنَا ''تاکہ اپنی کچھ قدرت کی نشانیاں انھیں آنکھوں سے دکھائیں''...... یہ ہے حبیب کی شان کہ خالق خود مشتاق ہے کہ اپنی صناعیوں کا انھیں مشاہدہ کرائے۔

اب جو اپنا حبیب ہے، اس سے بے تکلف، بلامحابا، بغیر مجاز و استعارہ کی نقاب ڈالے ہوئے انتہائے تحقیق کے ساتھ وہ کہہ رہا ہے: اِنَّکَ مَیِّتٌ.

"بلاشبہ یقیناً آپ مرنے والے ہیں" تو اب یہ کوئی برائی ہوتی تو خالق اپنے حبیب کے لئے اسے کیوں گوارا کرتا۔ جونام لے کر بھی کبھی انھیں نہ پکارے جبکہ نام لے کر ہر نبی کو پکارا ہو مگر ہمارے رسولِ کو ایک دفعہ بھی نام لے کر نہ پکارے۔ ہمیشہ القاب و اوصاف وغیرہ سے تخاطب کرے، وہ اس طرح سے کہے کہ یقیناً آپ مرنے والے ہیں، تو اب کون ایسا ہے جس کی شان کے خلاف ہم موت کو سمجھیں؟ جب پیغمبرؐ کے لئے وہ کوئی برائی نہیں تو کسی دوسرے کے لئے وہ کیا برائی ہو سکتی ہے؟ اور اگر پسماندگان کے لئے یہ کوئی برائی ہے یعنی جس کے عزیز کا ساتھ چھوٹا ہے اس کے لئے تو میں کہتا ہوں کہ یہ اگر کوئی برائی ہوتی تو پیغمبرؐ کو کسی کی جدائی کا داغ نہ اٹھانا پڑتا حالانکہ زیادہ تر افراد ایسے ملیں گے جنھیں کبھی ایک قسم کا صدمہ اٹھانا پڑا ہو اور ہمارے پیغمبرؐ کو تو جتنی قسم کے صدمے ہیں سب اٹھانا پڑے۔ سب سے پہلے باپ کا سایہ سر سے اٹھا۔ کوئی یتیم ہوتا ہوگا کسی خاص عمر میں اور ہماری شرع کے لحاظ سے یہ ہمارا محاورہ بالکل غلط ہے کہ جب بھی باپ کا سایہ سر سے اُٹھے تو ہم اس کی اولاد کو یتیم کہتے ہیں یہ شرعی حیثیت سے درست نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہاں یتیم میں نابالغ ہونے کی شرط ہے۔ بالغ افراد باپ کے انتقال سے شرعاً یتیم نہیں قرار پاتے۔ بہر حال شرعاً یتیم ہونے میں بچپن کی جو شرط ہے اس میں آخری حد پندرہ برس تک کی ہے یعنی اس سے کم جو بھی عمر ہو، وہ نابالغ ہے لہٰذا باپ کا سایہ اٹھا تو وہ یتیم ہوگیا۔ لیکن ہمارے پیغمبرؐ وہ تو ابھی شکم مادر میں تھے دنیا میں آئے بھی نہ تھے کہ باپ کا سایہ اٹھ گیا۔ یعنی آپ پیدا ہی ہوئے دنیا میں یتیم۔ اب عام واقعہ ہے کہ جب باپ کا سایہ اٹھ جاتا ہے تو ماں اپنے کو دو شفقتوں کی ذمہ دار سمجھنے لگتی ہے۔ یعنی اسے اپنے بیٹے ہونے کے علاوہ یہ احساس بھی برابر ہوتا ہے کہ یہ بن باپ کا ہے مگر ہمارے پیغمبرؐ چھ برس کی عمر کے ہیں کہ ماں کا سایہ بھی سر سے اٹھ جاتا ہے۔

جناب آمنہ بنت وہب مدینہ منورہ اپنے میکے گئی تھیں اور وہاں، سے واپس ہو رہی تھیں تو ابھی مکہ معظمہ تک پہنچیں نہ تھیں کہ مقام ابوا ایک جگہ ہے مکہ سے باہر وہاں وفات ہوگئی۔ اب اس سلسلہ میں ایک متفق علیہ تاریخ کا واقعہ بیان کر رہا ہوں۔ یاد رکھئے چھٹا برس تھا۔ اب کمالات

رسالت کے لحاظ سے نہیں۔ عام بشری زندگی کے لحاظ سے کوئی دیکھے تو ۶ ربرس کی عمر وہ ہوتی ہے کہ اس وقت کی باتیں بہت مدت گذرنے کے بعد یاد نہیں رہا کرتیں۔ آپ چالیس برس کی عمر میں مبعوث بر رسالت ہوئے ہیں تو ماں کی وفات کے چونتیس برس کے بعد بعثت ہوئی ہے اور بعثت کے ۱۳ ربرس کے بعد ہجرت ہوئی ہے اور ہجرت کے آٹھ برس کے بعد فتح مکہ ہوئی ہے تو کتنی طولانی مدت ہوگئی، مگر اس مدت کے بعد جب فتح مکہ ہوتی ہے تو زندگی کے چھٹے برس جس ماں کا انتقال ہوا تھا، اس کی یاد اتنی شدت سے ہے کہ حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اصحاب سے فرماتے ہیں کہ میں نے اللہ سے اپنی ماں کی قبر کی زیارت کے لئے اجازت مانگی اور اللہ نے مجھے اجازت عطا فرمائی ہے لہٰذا میں جارہا ہوں اور اب جتنے حاضر الوقت اصحاب ہیں، وہ سب رسولؐ کے ساتھ جارہے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اجازت تو رسولؐ نے اپنے لئے حاصل فرمائی تھی یہ اصحاب کیوں جارہے ہیں؟ مگر حقیقت یہ ہے کہ رسولؐ تو جارہے ہیں اذن الٰہی سے اور اصحاب جارہے ہیں باتباع رسولؐ اور اب رسولؐ اس عمر میں دنیا سے اٹھی ہوئی ماں کے غم میں جب قبر پر ماں کی پہنچتے ہیں تو گریہ فرمارہے ہیں اب ہمت ہو تو رسولؐ پر فتوے جاری کریں۔ رسولؐ گریہ فرمارہے ہیں اور اس وقت کے جتنے اصحاب ہیں وہ پیغمبرؐ کے ساتھ شریک گریہ ہیں۔

میں مسلمانوں کو متوجہ کرتا ہوں کہ رسول کو کہہ لیجئے کہ بتقاضائے بشریت رورہے ہیں۔ اس لئے کہ بیٹے ہیں، ماں کو یاد کیا ہے لیکن یہ اصحاب کیوں رورہے ہیں۔ ان کا کوئی رشتہ جناب آمنہ سے نہ تھا۔ ان کو کوئی نسبی تعلق نہ تھا، ماننا پڑے گا کہ یہ رسول کو روتا دیکھ کر بہ اتباع رسول ان کے تاثر سے گریہ کررہے ہیں تو میں کہتا ہوں کہ فعل رسولؐ چاہے بہ تقاضائے بشریت ہو لیکن یہ دوسروں کا گریہ تو بہ تقاضائے ایمان ہی ہے۔ لہٰذا بلاشبہ عبادت ہے۔ اب دنیا فیصلہ کرے کہ ماں کے غم میں رسولؐ رورہے ہیں تو مسلمان بہ اتباع رسولؐ بغیر اندیشۂ الزام بدعت گریہ کریں اور پیغمبرؐ معترض نہ ہوں اور رسولؐ اپنے نواسے پر گریہ کررہے ہیں اور ایسا کہ عمر بھر روتے رہے ہوں تو اب مسلمان یہ سوچیں کہ ہمارے واسطے گریہ سنت ہے یا بدعت؟

حضور! اب مجھے بیان کو سمیٹنا بہت ضروری ہے۔ وقت اب بہت کم رہ گیا ہے۔ ماں کا سایہ اٹھ گیا، اب رسول کا سن ہوا آٹھ برس، دو برس ماں کے گذرنے کے بعد دادا کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ جناب عبدالمطلب نے کس شان سے تربیت کی ہے؟ اس شان سے ظاہر ہے کہ فقط دادا پوتے کی تربیت جس شان سے کرتا ہے اس طرح نہیں کر رہے ہیں بلکہ عجیب خصوصیت ہے۔

طبقات ابن سعد طبری سے بھی مقدم کتاب ہے جو فقط مصر میں نہیں بلکہ ہالینڈ میں بھی چھپ چکی ہے۔ طبری چوتھی صدی کے عالم ہیں اور ابن سعد تیسری صدی کا مورّخ۔ وہ لکھتا ہے: جناب عبدالمطلب بڑے جاہ وجلال کے آدمی تھے، کعبہ کی دیوار سے ملا کر ان کی مسند بچھتی تھی۔ تمام معززین عرب اس کے گرد آ کر بیٹھتے تھے۔ گویا دربار ہوتا تھا۔ تو جب تک عبدالمطلب برآمد نہ ہوں ان کے کسی بیٹے کی مجال نہ تھی کہ اس مسند پر آ کر قدم رکھے لیکن اس کمسنی کے عالم میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آتے تھے تو سیدھے اس مسند کی طرف جاتے تھے۔ کبھی ایسا ہوا کہ جناب عبدالمطلب آتے ہوئے اور کسی نے اولاد عبدالمطلب میں سے، آپ کے چچا تھے، ہٹانا چاہا ادھر عبدالمطلب نے دیکھا تو کہا: دَعُوْهُ فَاِنَّ لَهُ شَانًا كَبِيْرًا۔ ارے اسے چھوڑ دو۔ اس کی بڑی شان ہے۔ بڑی شان، کہنے سے پتہ چل گیا کہ دادا پوتے کو نہیں پال رہا ہے بلکہ عارف شان صاحب شان کی پرورش کر رہا ہے۔ اب عبدالمطلب دنیا سے اٹھ رہے ہیں اور ان کے دس بیٹے ہیں اسی لئے اَبُو السَّادَةُ الْعَشَرَة کہے جاتے ہیں مگر تمام بیٹوں میں مخاطب ہوتے ہیں ایک کی طرف، اے ابوطالب ابھی تک میں اس کی پرورش کر رہا تھا۔ اب میں اس کو تمہارے سپرد کر رہا ہوں۔ تم اس کی پرورش کرنا، میں کہتا ہوں کہ جناب عبدالمطلب ایسا صاحب بصیرت جو تینتیس ۳۳ برس بعد کی شان کے ایک بچہ کا اندازہ کر رہا ہے، وہ اپنے بیٹوں کی حالیہ شان کو نہیں جانتا؟ ماننا پڑے گا کہ ان کی مردم شناس نگاہ دیکھ رہی تھی کہ اس شان کی جس کا عارف میں ہوں معرفت میرے تمام بیٹوں میں سے ایک اسی کو ہے۔ اب جناب ابوطالب جو حقیقی چچا ہیں تربیت وکفالت کے ذمہ دار ہوتے ہیں اور اب ان کی تربیت کی عمر اتنی طولانی ہے کہ پہلے فطرت کی زبان میں کہوں کہ اس تربیت کے دوران میں رسول کا بچپنا جوانی

سے گلے مل رہا ہے اور اب مسلمانوں کے ایک مکتب خیال کی زبان میں کہوں کہ پھر انہیں کے دور تربیت میں بشریت رسالت سے گلے ملتی ہے اَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی. اللہ اپنے احسانات میں کہہ رہا ہے کہ اللہ نے آپ کو یتیم پایا تو پناہ نہیں دی؟

اب یہاں مفسرین چاہے جس مکتب خیال کے ہوں، چاہے جلالین ہوں، چاہے نیشاپوری ہوں، چاہے رازی ہوں اور چاہے کوئی اور ہوں یہاں مجبور ہے ہر مفسر کہ ''اللہ نے یتیم پایا آپ کو تو کیا پناہ نہیں دی؟ اس کے تحت میں عبدالمطلب کا نام نہیں لکھتا۔ ماں کا ذکر نہیں کرتا، کیونکہ جب خدا احسان جتائے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ دو، چار، چھ برس میں ختم ہو جائے۔ بلکہ وہ لکھتا ہے: بِعَمِّہٖ اَبِیْ طَالِبٍ. (یعنی) آپ کو پناہ دی۔ آپ کے چچا ابو طالب کے ذریعہ سے اب میں ایک لفظ کی طرف توجہ دلاؤں گا کہ یہ رواداری کا ترجمہ ہے جو میں یہ کہوں کہ یتیم پایا تو اللہ نے پناہ دلوائی اٰوٰی کے معنی ''پناہ دلوائی'' نہیں ہیں بلکہ اللہ نے پناہ دی۔

میں کہتا ہوں کہ یہ بڑی منزل بلند ہے انسان کی، فعل ہو انسان کا اور اللہ اپنا فعل کہے۔ ہم رسولؐ کے لئے مقام بیان فضیلت میں کہتے ہیں کہ:

وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی.

وہ آپ نے سنگریزے نہیں پھینکے بلکہ اللہ نے پھینکے۔

اس میں اللہ نے پیغمبرؐ کے کام کی نسبت اپنی طرف دی ہے یہاں بھی پناہ دینا تو ابو طالب کا عمل ہے۔ مگر خدا کہتا ہے اس نے پناہ دی وہی بات ہے کہ عمل بندہ کرتا ہے اور اللہ خود اپنا عمل کہتا ہے۔

یہ ایک نوعیت کے یعنی بزرگوں کے صدمے تھے۔ اب انہیں جناب ابو طالب نے رسولؐ کی جو شادی کی تھی اور وہ صرف ایک خاتون تھیں جن کے ساتھ ابو طالب نے رسول کا عقد کیا تھا۔ جناب خدیجہؑ اور ان کا ایثار اسلام کی راہ میں وہ تھا کہ اسی سورہ میں اس کا ذکر بھی فرمایا گیا: اَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی ذرا ہی بعد ارشاد ہوا: وَوَجَدَکَ عَآئِلًا فَاَغْنٰی. اس نے اپنے آپ کو پریشان حال پایا تو دولتمند بنایا۔

یہاں بھی مفسرین یہ لکھنے پر مجبور ہیں کہ دولتمند کیا خدیجہ کی دولت کے ذریعہ سے۔ یہ وہ پاک کمائی تھی جسے اللہ نے اپنے رسولؐ کے لئے سرمایۂ دین اسلام بنانے کے لئے تجویز فرمایا۔ یہ عدل الٰہی ہے کہ وہ دو ہستیاں ایک دوسرے کی شریک حیات ہونے کے اعتبار سے ہمسر تھیں، ایک ہی سورہ میں۔ ان میں سے ایک کے باپ کا ذکر کیا تو دوسرے کی ماں کا۔ ماشاء اللہ مجالس کا ذوق رکھنے والوں کے لئے تو اتنا ہی کافی ہے مگر ان کے لئے جو نو وارد ہیں فی الجملہ تشریح کردوں کہ وہ ابو طالب کا ذکر تھا۔ جو حضرت علیؑ کے والد بزرگوار ہیں اور یہ حضرت خدیجہؓ کا ذکر ہے جو جناب فاطمہ زہراء کی والدۂ ماجدہ ہیں۔

ایک ہی سورہ میں اللہ نے دونوں کا جو اسلام پر احسان ہے اس کا تذکرہ: اب قرآن تو ان کے احسان کی قیامت تک کے لئے یاد محفوظ رکھنا ضروری سمجھے اور ہم ایسے احسان ناشناس ہوں کہ ان کے ایمان کو قابل بحث قرار دیں۔ بہرحال یہ بی بی اور وہ سرپرست چچا جو پہلے ذات پیغمبرؐ کی حفاظت کے کفیل تھے اور اب آپ کے پیغام کی حفاظت کے ذمہ دار بن گئے۔ ابھی تک تربیت بانی اسلام کر رہے تھے اور اب تربیت اسلام میں ان کے معاون و مددگار بلکہ سینہ سپر بلکہ قلعۂ حفاظت ہیں۔ متفق علیہ تاریخوں کے لحاظ سے جناب ابوطالب اور جناب خدیجہ، دونوں ہستیاں تقریباً ایک ساتھ فدیۂ اسلام ہوئیں۔ یعنی اس چار برس کے محاصرہ شعب ابی طالب سے جب کئی کئی وقت غذا نہیں ملتی تھی، باہر نکلے تو ایک مہینے کے اندر وہ بی بی بھی دنیا سے اٹھیں اور وہ چچا بھی جان بحق تسلیم ہوئے اور پیغمبر کو اتنا صدمہ ہوا کہ اس سال کا نام "عام الحزن" ہوگیا۔ غم کا سال۔ اور یہ ناواقف مسلمانوں کے لئے کہتا چلوں کہ تاریخ اسلام میں کوئی خوشی کا سال ہمیں معلوم نہیں مگر غم کا سال جزِ تاریخ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ خوشی کی بات اتنی یاد رکھنے کی نہیں ہے۔ جتنی غم کی بات یاد رکھنے کی ضرورت ہے۔ اب یہ دوسری قسم کا صدمہ یعنی شریک حیات اور رفیق زندگی کا ہے۔ اور پیغمبر نے آخری دور حیات تک اس بیوی کو یاد کیا متفق علیہ واقعات ہیں کہ برابر خدیجہ کا ذکر فرماتے رہے۔ جو خدیجہ کی ملنے والی عورتیں تھیں۔ وہ کبھی آجاتی تھیں تو دیر دیر تک ان سے تذکرے ان کے رہتے تھے یہ تھا

تقاضائے بشریت یا نفسانیت کہ کچھ حاضر الوقت شخصیتوں کو گراں گذر گیا اور پیغمبرؐ سے کہا کہ یہ کب تک آپ ایک بوڑھی عورت کو یاد کرتے رہیں گے۔ آپ کو اللہ نے اس سے بہتر عطا فرما دی۔ یہ سن کر صاحب خلقِ عظیم کی جبین پر شکن آ گئی۔ اور آپ نے ارشاد فرمایا: ارے اس سے بہتر کا کیا ذکر، اس کے مثل بھی مجھے نہیں ملی۔ اور اس کے بعد خدیجہ کے جوہر کردار کو ان کی بلندی کے اظہار میں پیش فرمایا جس سے یہ اصول ثابت ہو گیا کہ عورت کی حقیقی مدح کیا ہے؟ ارشاد فرماتے ہیں:

لَقَدْ صَدَّقَتْنِیْ اِذَا کَذَبَ النَّاس.

اس نے میری اس وقت تصدیق کی جب دنیا جھٹلا رہی تھی۔

وَاٰمَنَتْ بِیْ اِذَا کَفَرَ النَّاسُ.

وہ اس وقت ایمان لائی جب دنیا کافر تھی۔

اور آخری جملہ یہ ہے:

رَزَقَنِیَ اللّٰہُ فِیْھَا اَوْلَادًا.

اور اللہ نے اس سے مجھے اولاد عطا کی۔

اس سے بڑھ کر رفعت کسی اور خاتون کی کیا ہو سکتی ہے۔

عمر بھر صدمہ ان بیوی کا رہا اور چچا کو بھی بعد میں جب موقع آیا یاد کرتے رہے یہ بھی ذکر ہے تاریخ میں کہ مدینہ میں قحط پڑا۔ بارش کے لئے رسولؐ نے دعا کی جس سے بارش ہوئی۔ لوگ رسول کو مبارکباد دے رہے تھے۔ آپ فرماتے ہیں: ارے کوئی ہے جسے میرے چچا ابو طالب کے وہ اشعار یاد ہوں۔ یہ اشعار قصیدۂ لامیہ میں ان کے ہیں جو آج تک محفوظ ہے۔ انہیں میں سے ایک شعر یہ ہے:

وَاَبْیَضَ یُسْتَسْقَی الْغَمَامُ بِوَجْھِہٖ ثِمَالُ الْیَتٰمٰی عِصْمَۃٌ لِلْاَرَامِلِ

رسول کی مدح میں فرماتے ہیں: ”وہ گورے رنگ والا“ اس میں وہ فطری کیفیت ہے جس سے محسوس ہوتا ہے کہ ایک بڑا بوڑھا اپنے ایسے خورد کی جو مثل اولاد ہے تعریف کر رہا ہے

اور اب اس کی شان بلند کا اظہار ہے کہ جس کے چہرہ کے بدولت ابر سے پانی طلب کیا جاتا ہے۔ وہ یتیموں کا خبر گیر اور بیواؤں کا دستگیر ہے۔ ابو طالب کا شعر آپ اس وقت یاد کر رہے ہیں، جب مدتیں گذر چکی ہیں چچا کو دنیا سے گئے ہوئے۔

اس کے علاوہ، اولاد کے صدمے تو سب جانتے ہیں کہ جناب خدیجہ سے اللہ نے کئی بیٹے آپ کو عنایت فرمائے تھے۔ طیب، طاہر اور ایک روایت میں ایک فرزند کا نام اپنے والد بزرگوار کے نام پر رکھا تھا عبداللہ اور قاسم جن کے نام پر آپ کی کنیت ہے ابوالقاسم جن کا داغ پیغمبرؐ نے اٹھایا۔ تو اب کون صدمہ ہے جو رسولؐ نے نہ اٹھایا ہو اور اب کون سی موت ہو سکتی ہے جسے برائی سمجھا جائے مگر یاد رکھئے کہ برائی ہونا نہ ہونا دماغ کا فیصلہ ہے اور گریہ ہونا دل کا تقاضا ہے اسلام دین فطرت ہے۔ دماغ سے مطالبہ ہے کہ وہ حقیقت کو سمجھے مگر دل کی فطرت کا جو تقاضا ہے، وہ ممنوع نہیں ہے۔ رونے کا حق تمہیں ہے، یہ محبت نہ رکھنے والا دل ہے جو منطقی اعتراض کراتا ہے۔ چاہنے والا نہیں کہے گا کہ زندہ جاوید کو کیوں روتے ہو؟ میں کہتا ہوں کہ فاطمہؑ زہراء کیا رسولؐ کے مرتبہ سے معاذ اللہ واقف نہیں ہیں پھر انھوں نے گریہ کیوں فرمایا۔

اب یہ اپنے گھر کے ایک بزرگ کی مجلس ہے لہٰذا خاندان رسالت کی جو بزرگ ترین فرد ہے، اس کی وفات کے سلسلہ میں مصائب عرض کرنا چاہتا ہوں۔

یقیناً کوئی بیٹی باپ کو اتنا نہیں روئی، جتنا فاطمہؑ زہراء اپنے باپ پر گریاں رہیں۔

اب یہاں کتابوں میں ایک ایسا واقعہ درج ہے جسے پڑھ کر نہ صرف اسلامی بلکہ انسانی نقطۂ نظر سے ہمارا دل چاہتا ہے۔ یہ ورق نہ ہوتا۔ حضور! محلہ میں بہت سے اجنبی رہتے ہیں جن سے ہمارا کوئی خاص تعلق نہیں ہوتا بلکہ بسا اوقات شناسائی بھی نہیں ہوتی، پھر بھی ان کے یہاں کوئی سانحہ ہو، گھر والے رو رہے ہوں تو کون پڑوسی ہے جو اس دن خوشی کے ساتھ کھانا کھائے؟ کون پڑوسی ہے جو اطمینان کے ساتھ سوئے ایک گھر میں کہرام پڑا ہے تو نیند تو ہمسایہ کی حرام ہوگی۔ مگر بخدا آج ہماری تہذیب اور انسانیت گوارا نہیں کرے گی کہ اس گھر والوں کے پاس جائیں اور ان سے

کہیں کہ تمہارے رونے سے ہماری نیند اڑتی ہے، تمہارے رونے سے ہمیں کھانے میں مزہ نہیں ملتا لہٰذا تم رونے میں کمی کرو، مگر کیا کیا جائے، یہ واقعہ ہے کہ عظیم ترین معلم اخلاق دنیا سے گیا، اس کی بیٹی اپنے باپ کے غم میں رو رہی ہے تو اہل محلہ کا وفد آتا ہے۔ علیؑ کے پاس ''یا علیؑ! ہماری طرف سے جا کر فاطمہؑ زہراء سے کہیئے کہ ان کے دن رات رونے سے ہمیں کھانے پینے سے نہ مزہ ملتا ہے اور نہ ہم رات کو اطمینان سے سو سکتے ہیں، یا دن کو روئیں، رات کو خاموش رہیں یا رات کو گریہ کریں دن کو خاموش رہیں۔ اب اندازہ کیجئے۔ انسانی فطرت کے لحاظ سے ہم اور آپ کو اس ذکر سے کتنی تکلیف ہوتی ہے تو علیؑ کے دل پر کیا گذری؟ مگر وہ تو رسولؐ امین کے جانشین تھے۔ آپ نے فرمایا کہ تمہارا پیغام جا کر پہنچائے دیتا ہوں اب حضرت علی ابن ابی طالبؑ نے باقتضائے بلاغت کتنا ہی ہلکا کر کے اس پیغام کو پہنچایا ہو۔ لیکن بات تو وہی کہنا تھی۔ اس کے بعد فاطمہؑ زہرا کے دل پر کیا گذری؟ مگر وہ صاحب خلق عظیم کی بیٹی تھیں۔ انھوں نے زبانی تو یہ جواب دیا کہ فرمایا: ان لوگوں سے کہیئے کہ تمہاری زحمت کی عمر طولانی نہیں ہے۔ مجھے میرے بابا خبر دے گئے ہیں کہ میں بہت جلدی ان کی خدمت میں چلی جاؤں گی۔ جواب تو یہ دیا لیکن خود ان کی ایک ناروا فرمائش کا گویا احترام اتنا کیا کہ دوسرے دن سے صبح کو بیٹوں کا ہاتھ پکڑ کر ان کے ساتھ جنت البقیع چلی جاتی تھیں۔ اب یہاں ایک نفسیاتی حقیقت ہے جسے راویوں نے چاہے بیان نہ کیا ہو مگر اس سے کہ بیٹوں کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لے جاتی تھیں۔ میرا ذہن اس صورت واقعہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے کہ ہوتا یہ تھا کہ فاطمہؑ نے اپنے باپ کو رونا شروع کیا تو بچے بھی شریک ہو گئے رونے میں اور بس ایک مجلس برپا ہو گئی۔ اب سیدۂ عالم ان اہل محلہ کی فرمائش کی امکانی تعمیل کرنا چاہتی ہیں مگر رونے پر قابو نہیں ہے کہ رونے کے لئے اوقات مقرر کریں۔ ہاں گھر میں اپنے رہنے کا وقت مقرر کرتی ہیں کہ میرے گریہ کی آواز جوان تک مسلسل پہنچتی ہے جو ان کے لئے پریشان کن ہے۔ وہ کم از کم دن میں ان تک نہ پہنچے لہٰذا صبح کو جنت البقیع چلی جاتی ہیں اور وہاں شام تک روتی ہیں اور اب چاہتی ہیں کہ جو شرکائے مجلس ہیں، وہ بھی میرے ساتھ رہیں اور جب رات ہوتی ہے تب گھر واپس آتی ہیں۔ بس آخر میں یہ تذکرہ سن لیجئے کہ بلال

نے جو موذن رسولؐ تھے عہد کرلیا کہ وہ رسولؐ کے سوا کسی کے لئے اذان نہ کہیں گے سمجھتے تھے کہ مدینہ میں رہ کراس کا نباہنا مشکل ہے لہٰذا مدینہ چھوڑ دیا، شام چلے گئے۔ وہاں رہنے لگے مگر جسے پیغمبرؐ سے اتنا لگاؤ تھا اس سے رسولؐ کو لگاؤ نہ ہوتا؟ خواب میں رسولؐ کو دیکھا فرماتے ہیں: ''ہم نہیں رہے تو تم نے ہماری ڈیوڑھی بھی چھوڑ دی؟'' یہ خواب دیکھا تو اتنے بیتاب تھے کہ بغیر سامانِ سفر درست کئے ہوئے پشت شتر پر سوار ہوئے اور روانہ ہوگئے اور تیزی کے ساتھ روانہ ہوئے۔ مدینہ کے قریب پہنچ کر کسی ہم سفر یا راہ گیر نے جو اتفاقاً راہ میں مل گیا تھا، مدینہ جا کر رفتار سفر کا اندازہ لگاتے ہوئے اطلاع کردی کہ بلال فلاں دن پہنچ جائیں گے۔ تو روایت بتاتی ہے کہ اس دن پورا مدینہ امنڈ پڑا۔ پردہ نشین عورتیں تک گھروں سے نکل آئیں، استقبال بلال کو اور بلال پہنچ گئے۔

اب واقعات کی ایک کڑی ہے جس کی تاریخ نے بروقت بیان نہیں کیا تھا وفات رسولؐ کے موقع پر تاریخ کی پوری توجہ سیاسی سرگرمیوں پر مرکوز ہوگئی اب تاریخ کے راویوں کو کہاں فرصت تھی کہ وہ اس اثر کو بیان کرتے جو وفات رسولؐ کا عام مسلمانوں پر ہوا تھا، کیونکہ عام مسلمان اس وقت کے جو سب صحابہ اور صحابیات تھے تو ان سب کو تو سیاست کی سرگرمیوں سے بذات خود کوئی تعلق نہ تھا۔ ان پر جو فطری اثر وفاتِ رسولؐ کا تھا، اس کا پتہ اب چلتا ہے جب بلال کے آنے کے موقع پر تاریخ میں یہ جملہ آیا کہ:

مَا رُبِیَ مِنَّا یَفْقِدِ رَسُوْلِ اللّٰہِ اَکْثَرُ بَاکِیًا وَبَاکِیَۃً مِنْ یَوْمِ اَقْبَلَ بِلَالٌ۔

(یعنی وفات رسولؐ کے بعد سے یہ کہرام رونے والوں اور رونے والیوں کا سنائی نہیں دیا جو آج تھا جب بلال وارد ہوئے۔)

تو اس جملہ سے معلوم ہوگیا کہ وفات رسولؐ کے موقع پر بھی سارے مدینہ میں ٹیس تھی اور عظیم کہرام شدت گریہ سے برپا تھا۔ اس کے بعد پھر یہ کہرام آج ہوا جب بلال آئے۔

اب سب تو بلال کے استقبال کو آئے ہیں اور بلال سیدھے روضۂ رسولؐ پر جاتے ہیں وہاں حسنؑ و حسینؑ نظر آئے۔ بلال نے شاہزادوں کو اُٹھا کر کاندھوں پر چڑھالیا۔ اب ہر ایک کہہ رہا

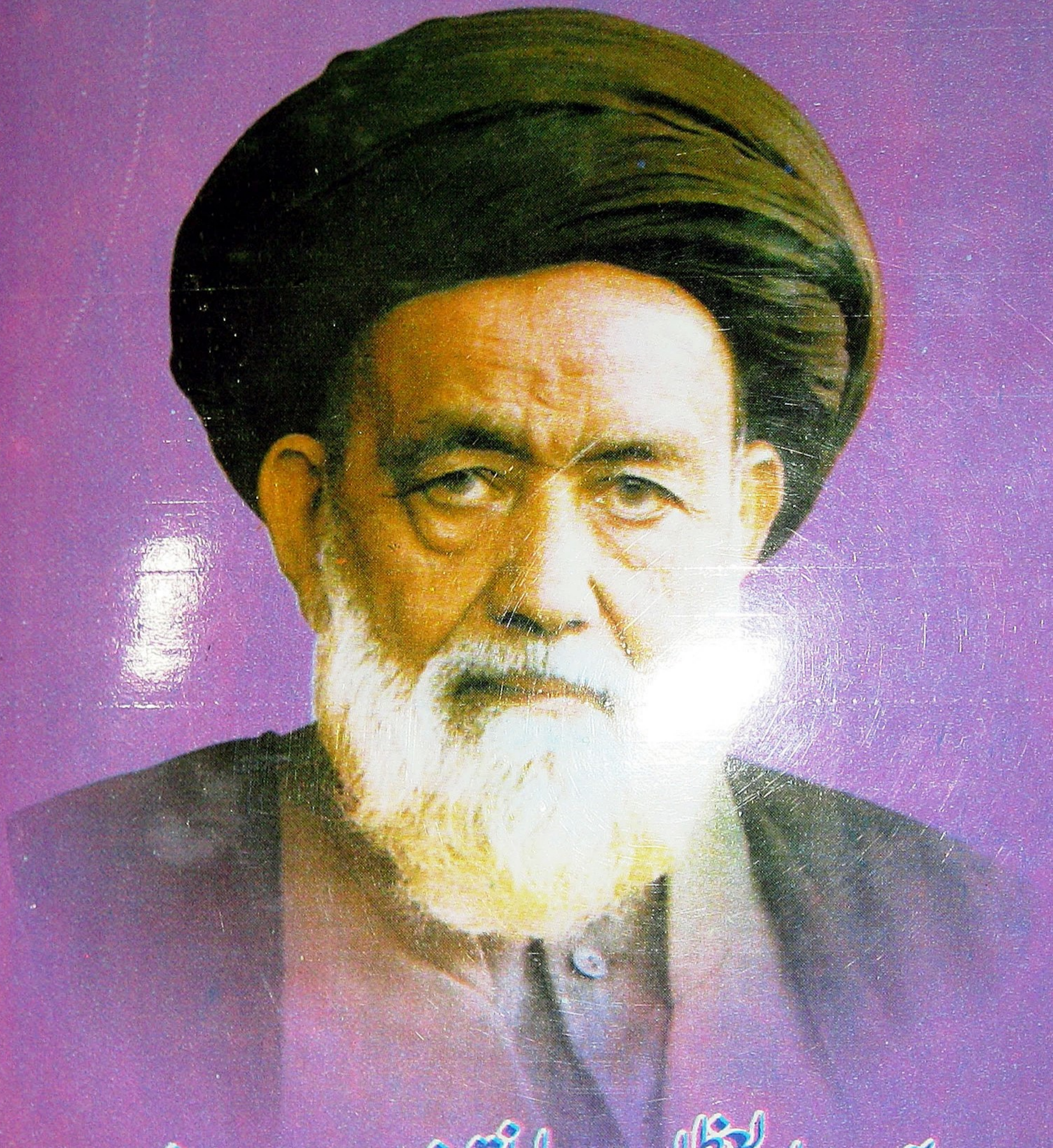
ہے کہ انھیں ہمیں دے دیجئے اور یہ کہتے ہیں، نہیں نہیں ارے میں نے تو رسول کو دیکھا ہے کہ انھیں کاندھوں پر چڑھائے ہوئے ہیں۔ آج مجھے یہ سعادت حاصل ہوئی ہے۔ ماشاء اللہ آپ بہت مثاب ہو رہے ہیں۔ اب بلال کہاں آئے؟ وہاں جسے رسول کی ڈیوڑھی سمجھتے تھے یعنی خانہ جناب سیدہ عالم، اپنا سلام کہلوایا اور سیدہ عالم نے جو سلام کے بعد کہلوایا کہ بلال! جب سے بابا کا سایہ اٹھا تمہاری آواز اذان بھی کان میں نہیں آئی۔ بلال نے جو واقعہ تھا عرض کرایا کہ مخدومہ عالم سے کہو کہ رسولؐ کے بعد میں نے عہد کرلیا ہے کہ اذان کسی کے لئے نہیں کہوں گا بس جو واقف ہیں، وہ واقف ہیں جو نہیں واقف ہیں ان کے لئے میں عرض کرتا ہوں کہ عہد امر شرعی ہے۔ فقہ کی کتابوں میں جیسے نذر کا باب ہے، قسم کا باب ہے اسی طرح عہد کا بھی باب ہے۔ اس کا بھی صیغہ شرعی ہوتا ہے۔ حضور! بلال نے تکلفانہ کوئی عذر نہیں کیا تھا ایک امر شرعی کی مجبوری کا اظہار کیا تھا۔ اب سیدہ عالم سے زیادہ واقف شرع کون ہوسکتا ہے؟

سیدہ عالم نے فرمایا بلال سے کہو تمہیں میرے حق کی قسم ہے کہ ایک دفعہ میرے لئے اذان کہہ دو۔ نکتہ رس حضرات غور کریں میں کہتا ہوں بلال نے ایک امر شرعی پیش کیا تھا۔ سیدہ عالم نے یہ جملہ سن کر کہا۔ اب بلال پھر کہیں کہ میں کیا کروں میں نے تو یہ عہد کیا ہے۔ مگر یاد رکھئے کہ اجتہاد کوئی عجوبہ چیز نہیں ہے جو آج نجف میں ہوتا ہے۔ ایران میں ہوتا ہے ممکن ہے ہندوستان میں بھی کہیں ہوتا ہو وہ فطرت کا تقاضا ہے۔ زمانہ رسولؐ اور آئمہ میں بھی ہوتا تھا دلیل شرعی سے عقل سلیم اور ذہن مستقیم کی مدد سے نتیجہ نکالنا۔ اسی کا نام اجتہاد ہے۔ میں کہتا ہوں کہ بلال عوام میں سے نہیں تھے وہ ملکہ اجتہاد رکھتے تھے۔ انھوں نے سیدہ عالم کا پیغام سنتے ہی ایک لمحہ میں منازل استنباط کو طے کیا۔ صغریٰ و کبریٰ مرتب کر کے نتیجہ نکال لیا۔ حدیث رسولؐ یاد آگئی کہ پیغمبر نے فرمایا ہے۔ فَاطِمَۃُ بِضْعَۃٌ مِنِّی جو صحیح بخاری میں بھی اب تک موجود ہے، فاطمہ میرا ایک جز ہے جس نے اس کو اذیت پہنچائی، اس نے مجھے اذیت پہنچائی۔ مَنْ اٰذاھا فَقَدْ اٰذانِیْ اور جس نے اس کو غضبناک کیا اس نے مجھے غضبناک کیا وَمَنْ اَغْضَبَھا فَقَدْ اَغْضَبَنِیْ۔ اس سے عقل کی مدد سے یہ کلیہ بنا

کہ جو بات فاطمہؑ کے لئے ہو، وہ رسولؐ کے لئے ہوتی ہے۔ اب بلال سوچے کہ میں نے یہی تو عہد کیا تھا کہ رسولؐ کے سوا کسی کے لئے اذان نہیں کہوں گا۔ ارشاد رسولؐ سے سمجھ میں آتا ہے کہ فاطمہؑ کے لئے اذان دینا غیر رسولؐ کے لئے اذان دینا نہیں ہے۔ رسولؐ ہی کے واسطے ہے۔ پس ایک زمین برق رفتار کے ساتھ منزل اجتہاد طے ہوگئی اور بلال کو اطمینان ہو گیا کہ حضرت فاطمہؑ زہراء کے لئے اذان دینا میرے عہد کے خلاف نہ ہوگا لہٰذا فوراً کہہ دیا سَمْعًا وَطَاعَةً اب مخالفت ناممکن، بلال ماذنہ پڑ گئے اور اذان شروع کر دی۔ میں کہتا ہوں کہ یہ فطرت کا تقاضا ہے کہ مردوں کا اندازِ گریہ اور ہوتا ہے عورتوں کے بین کا طریقہ اور ہوتا ہے وہ کیسی ہی شخصیت ہو لیکن جو مرد ہے وہ مرد ہے جو عورت ہے وہ عورت ہے۔ جس طرح کے بین حضرت فاطمہؑ زہراء کے لئے مناسب ہیں۔ حضرت علی ابن ابی طالب پر نہیں کھپ سکتے جونہی بلال کی آواز آئی ایک دفعہ فاطمہؑ نے کہا بابا بلال اذان دے رہے ہیں؟ آپ نماز میں جانے کی تیار نہیں کرتے؟ اور بس گریہ شروع ہو گیا۔ بلال آگے بڑھے: اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ فاطمہؑ کے گریہ میں اضافہ ہوا۔ اب بلال نے کہا اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ اور بس اس کے بعد فاطمہؑ کا عالم یہ ہوا کہ ایک کنیز دوڑی آئی۔ کہا اے بلال! اذان ختم کرو۔ فاطمہؑ زہراء کی جیسے روح جسم سے مفارقت کر گئی ہے۔ اس طرح یہ اذان شروع ہوئی مگر ختم نہ ہو سکی۔

بس جناب! انشاءاللہ آپ نے گریہ کا اس وقت جو حق تھا وہ ادا کر دیا حالانکہ عام زبان میں تو کوئی مصائب بیان بھی نہیں ہوئے۔ مگر اب فاطمہؑ زہراء سے بس اتنا کہوں گا کہ شاہزادی! آپ نے بڑی عزت کے ساتھ اپنے باپ کا نام سنا تو آپ کا عالم یہ ہوا۔ سکینہؑ کے دل کی خبر لیجئے۔

آگے خروش گریہ کی وجہ سے ٹیپ ریکارڈ میں کوئی لفظ نہیں آسکی۔ گریہ، گریہ، گریہ اور مسلسل گریہ۔



آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

IMAMIA MISSION LUCKNOW

Maulana Ali Naqi Road, Chowk Lucknow-3.